جون ۱۹۹۹ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

اسلام ، جمہوریت اور پاکستان

ارشاد احمد حقانی کے نام امیر تنظیم اسلامی کا مکت

5869501-

6305110

رائٹ لمیٹڈ

ان شاء اللہ العزیز ——— نئے تعلیمی سال سے

مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام' ماڈل ٹاؤن لاہور میں

قرآن کالج فار گرلز

(چھٹی کلاس سے ایف اے تک)

کا اجراء حسب اعلان کیا جا رہا ہے۔

* فرسٹ ایئر میں داخلے میٹرک کا رزلٹ آنے کے فوراً بعد شروع ہو جائیں گے۔ (توقع ہے کہ 30 جون تک میٹرک کا رزلٹ آجائے گا)
* سکول و کالج کے مروجہ نصاب کے علاوہ دینی تعلیم و تربیت کا بھی مناسب اہتمام ہو گا۔
* کالج کے ساتھ ہاسٹل کی سہولت موجود نہیں ہے' لہٰذا بیرون لاہور سے صرف وہی بچیاں داخلہ کی درخواست دیں جن کے لئے لاہور میں اپنے طور پر قیام کی مناسب سہولت موجود ہو۔

پراسپکٹس 15 جون تک طبع ہو جائے گا' ان شاء اللہ

المعلن :

ناظم قرآن کالج 36۔کے' ماڈل ٹاؤن لاہور

فون : 03-5869501

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد کرو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

ماہنامہ

میثاق

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

جلد :	۴۸
شمارہ :	۶
صفر المظفر	۱۴۲۰ھ
جون	۱۹۹۹ء
فی شمارہ	-/۱۰
سالانہ زر تعاون	-/۱۰۰

ادارہ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب' کویت' بحرین' قطر، عرب امارات' بھارت' بنگلہ دیش' افریقہ' ایشیا، یورپ' جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران' ترکی' اومان' مسقط' عراق، الجزائر' مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت : 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700۔ فون : 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67۔ گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ' لاہور' فون : 6305110

پبلشر : ناظم مکتبہ مرکزی انجمن' طابع : رشید احمد چودھری' مطبع : مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرض احوال ـــــــــــــ ۳
حافظ عاکف سعید

☆ تذکرہ و تبصرہ ـــــــــــــ
"اسلام' جمہوریت اور پاکستان"
ڈاکٹر اسرار احمد

☆ دعوت و تحریک ـــــــــــــ ۲۱
انقلاب کا نبویؐ منہاج
محمد رشید عمر

☆ فتنہ ارتداد ـــــــــــــ ۲۹
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تاریخی کردار
مرتب : حافظ محبوب احمد خان

☆ اسوہ و سیرت ـــــــــــــ ۴۴
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت مدبر و منتظم
بیگم صغریٰ خاکوانی

☆ نماز میں خشوع (۱) ـــــــــــــ ۵۰
حقیقت و اہمیت اور اسباب
ترجمہ : ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

☆ فکر عجم (۱۷) ـــــــــــــ ۶۱
علامہ اقبال اور شعر فارسی۔ ایران کے حال و مستقبل کے آئینے میں
ڈاکٹر ابو معاذ

☆ سودی معیشت سے چھٹکارا ـــــــــــــ ۷۸
وقت کی اہم ترین ضرورت
حافظ عاکف سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد انگلینڈ' سکاٹ لینڈ اور ناروے کے ۱۸ دن پر محیط مختصر دعوتی دورے کے بعد پاکستان واپس تشریف لا چکے ہیں۔ اس دورے کا پروگرام چھ ماہ قبل ترتیب دیا گیا تھا۔ لندن میں مرد حضرات کے مقابلے میں حلقہ خواتین زیادہ فعال ہے۔ امیر تنظیم کی اہلیہ محترمہ کے علاوہ کہ جو تنظیم اسلامی حلقہ خواتین کی ناظمہ علیا بھی ہیں' اس سفر میں ناظم بیرون پاکستان ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب بھی امیر محترم کے ہمرکاب تھے۔ امید ہے کہ یہ دورہ برطانیہ اور ناروے میں قرآن کی انقلابی دعوت کے فروغ اور تنظیم اسلامی کے وسیع تر تعارف کا ذریعہ ثابت ہو گا۔

بیرون پاکستان سفر سے واپسی کے بعد جمعہ ۲۸ مئی کو مسجد دارالسلام میں امیر محترم نے "یوم تکبیر کے حقیقی تقاضے" کے موضوع پر خطاب ارشاد فرمایا۔ اس خطاب میں ملکی سیاسی صورتحال پر تبصرہ بھی شامل تھا۔ اس خطاب کا خلاصہ بصورت پریس ریلیز ذیل میں ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے :

"قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاء بنا کر اور ملکی معیشت کو سود کی نجاست سے پاک کر کے ہی "یوم تکبیر" کے حقیقی تقاضے پورے کئے جا سکتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے مسجد دارالسلام باغ جناح میں خطاب جمعہ میں کیا۔ انہوں نے کہا کہ بہتر ہوتا اگر ہم ۲۸ مئی کو یوم تکبیر کی بجائے اسے یوم تشکر کے طور پر مناتے۔ "یوم تکبیر" کو اپنی "بڑائی" اور ذاتی تشہیر کے لئے استعمال کرنا سنگین نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔ اسے "یوم تکبر" بنانے کی بجائے "یوم تکبیر رب" کے طور پر منایا جائے اور ملک میں اسلامی نظام نافذ کر کے اللہ کی کبریائی کو عملاً تسلیم کروایا جائے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے یہ تجویز پیش کی کہ "یوم تکبیر رب" ۲۸/ مئی کی بجائے ۱۲/ مارچ کو منایا جانا چاہئے کہ جس دن قرارداد مقاصد کی منظوری کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو ریاستی سطح پر تسلیم کیا گیا تھا۔ انہوں نے "تکبیر رب" کے تقاضوں کے طور پر میاں نواز شریف سے دو اقدامات کا مطالبہ کیا۔ ایک یہ کہ وہ پاکستان کے نظریاتی تشخص کو مضبوط کرنے کے لئے فی الفور قرآن و سنت کی بالادستی کے قیام کے لئے پندرھویں ترمیم میں متنازعہ ذیلی دفعہ (۲) میں ترمیم کر کے سینٹ سے منظور کرائیں۔ اس ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار پر عائد تمام پابندیاں ختم

کی جائیں اور علماء ججوں کی تعداد میں اضافہ کر کے شرعی عدالت کے ججوں کی شرائط ملازمت کو اعلیٰ عدلیہ کے مساوی کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اگر اللہ اور رسول کے ساتھ جنگ بند کرنے میں نواز شریف مخلص ہیں تو ملک سے سودی نظام کے خاتمے کے لئے اولین قدم کے طور پر راجہ ظفرالحق کمیشن کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے میں تاخیر سے کام نہ لیں۔

امیر تنظیم اسلامی نے پاکستان اور بھارت کے مابین کنٹرول لائن پر حالیہ کشیدگی اور بھارتی فضائی حملے کے جواب میں پاکستانی فوج کی جوابی کارروائی کو جرأت مندانہ اور باوقار طرز عمل کا مظہر قرار دیا۔ انہوں نے سپریم کورٹ پر حملہ کے مشہور مقدمہ میں "ملزمان" کو بری کرنے کے فیصلے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ فیصلہ عدلیہ کی بے بسی اور عدالتی نظام کی فرسودگی کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے جماعت اسلامی کی آل پارٹیز کانفرنس کے اس تجزیہ سے اتفاق کرتے ہوئے اسے مبنی برحقیقت قرار دیا کہ ملک کو رفتہ رفتہ فاشزم کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کے عادلانہ نظام کو نافذ کئے بغیر ملک کے مسائل حل نہیں ہو سکتے! انہوں نے اس امر پر بھی تشویش کا اظہار کیا کہ الیکٹرانک میڈیا کو تعلیم کے فروغ اور اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا ذریعہ بنانے کی بجائے اسے عوام کی توجہ ملک کو درپیش تلخ حقائق سے ہٹانے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ٹی وی کو حکمرانوں کے کارناموں کی تشہیر' اپوزیشن کی کردار کشی کے علاوہ عوام کو ڈراموں اور کھیلوں کی طرف راغب کر کے حقائق سے چشم پوشی کی جو روش اپنائی جا رہی ہے وہ ہرگز ملک و قوم کے مفاد میں نہیں ہے"۔

ہوسٹل وارڈن کی ضرورت ہے

قرآن اکیڈمی ہاسٹل کے لئے تجربہ کار' پختہ عمر اور اچھی صحت کے حامل ہاسٹل سپرنٹنڈنٹ' ترجیحاً ریٹائرڈ فوجی کی فوری ضرورت ہے۔ سنگل رہائش اور طعام ادارے کی جانب سے بلامعاوضہ ہو گا۔ رفقائے تنظیم اسلامی میں سے "اعزازی" طور پر یا "بامعاوضہ" خدمت سرانجام دینے والے خواہش مند حضرات فوری رابطہ فرمائیں۔

رابطہ روزانہ عصر تا عشاء (سوائے اتوار) قمر سعید قریشی

ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن' فون : 03-5869501

"اسلام' جمہوریت اور پاکستان"

معروف صحافی ارشاد احمد حقانی کی جانب سے اظہارِ خیال کی دعوت پر امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا نقطۂ نظر

جو روزنامہ "جنگ" کو ارسال کیا گیا

محترمی برادرم ارشاد احمد حقانی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"اسلام' جمہوریت اور پاکستان" کے عنوان سے آپ کی جو تحریر روزنامہ جنگ میں ۱۹ تا ۲۳/ مارچ ۹۹ء چار اقساط میں شائع ہوئی تھی اس کی تین قسطوں تک تو میرا یہ ارادہ پختہ ہوتا چلا گیا تھا کہ اس موضوع پر میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کروں گا' لیکن جب چوتھی قسط شائع ہوئی اور اس کے آخر میں آپ نے قارئین کو بھی اظہارِ خیال کی دعوت دی تو چونکہ اس کے ضمن میں آپ نے نہایت کڑی شرائط عائد کر دی تھیں لہٰذا قلم اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس لئے کہ اس سلسلے میں اس "گزارش" کی حد تک تو معاملہ غنیمت تھا کہ "ان مسائل پر سطحی اور غیر علمی تحریریں سپردِ قلم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں!" لیکن جب بات یہاں تک پہنچی کہ صرف "ایسے اصحاب قلم اٹھائیں جو زیر نظر موضوعات پر عبور رکھتے ہوں" تو چونکہ اب قلم اٹھانے کے معنی ان موضوعات پر "عبور" رکھنے کے دعویدار ہونے کے ہو گئے' لہٰذا ہمت بالکل جواب دے گئی ـــــ اس کے بعد آپ کی تحریر پر جو تبصرے شائع ہوتے رہے ان سب کو تو میں التزاماً نہیں پڑھ سکا البتہ کل (اتوار ۲۶/ اپریل) کی اشاعت میں جناب ایس ایم ظفر کا نام دیکھ کر نہ رہا گیا۔ چنانچہ میں نے نہ صرف یہ کہ ان کی تحریر کو غور سے پڑھا بلکہ ریکارڈ سے نکلوا کر آپ کی چاروں قسطیں بھی از سرِ نو نظر سے گزار لیں ـــــ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وضاحت کے ساتھ کہ میں ہرگز کسی بھی معاملے میں "عبور" کا مدعی نہیں ہوں' کچھ گزارشات پیش کرنے کی جرأت

کر رہا ہوں۔

مجھے ایس ایم ظفر صاحب کے برعکس آپ کی ان دو آراء سے مکمل اتفاق ہے کہ :

(۱) "اگر ہم پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک جدید اسلامی' روشن خیال' معاصر تقاضوں سے ہم آہنگ' جمہوری فلاحی مملکت بنانے میں ماضی کی طرح حال اور مستقبل میں بھی ناکام رہتے ہیں تو لوگوں کے لئے قیامِ پاکستان کا جواز سمجھنا روز بروز مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جائے گا" ـــــ اور

(۲) "ہم جس صورتحال سے دوچار ہیں وہ ایک بہت بڑا مخمصہ (DILEMMA) ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہیں!" ـــــ چنانچہ اِسی حقیقت کو میں نے اپنے حالیہ بیانات میں ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے کہ اگر پاکستان نے اپنے نظریاتی تشخص کو مضبوط اور مستحکم بنائے بغیر ہی بھارت کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھائیں تو یہ اس کے لئے "خودکشی" کے مترادف ہو گا۔

محترم ایس ایم ظفر کی "رجائیت" خواہ کتنی ہی قابل داد ہو' اور ان کے "نفس مطمئنہ" کو چاہے جتنا خراج تحسین ادا کر دیا جائے' انہوں نے زیر بحث موضوع کے ضمن میں انڈے کے خول سے نکلنے والے پرندے' اور میزائل کے ذریعے خلا میں پہنچائے جانے والے سیارے کی مثالوں کو جس انداز سے کسی ملک اور قوم اور اس کے ماضی کے باہمی تعلق پر منطبق کیا ہے وہ یا تو "قیاس مع الفارق" کے ذیل میں آئے گا یا "فرار عن الحقیقت" کے!! چنانچہ اُس قاعدہ کلیہ پر مستزاد کہ دنیا کی کوئی بھی قوم اور کوئی بھی ملک اپنے ماضی سے یکسر منقطع نہیں ہو سکتا' پاکستان کا معاملہ تو یہ ہے کہ اس جغرافیائی' نسلی اور لسانی ہر اعتبار سے "خالص مصنوعی" ملک کے معاملات کو اس کے وجود میں آنے کے عمل یعنی "GENESIS" کے پس منظر سے جدا کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔

رہا یہ سوال کہ تحریک پاکستان کے اصل عوامل کیا تھے' اور ان میں مذہب کو بھی کوئی مؤثر حیثیت حاصل تھی یا نہیں تو یہ بہت تفصیلی بحث کا متقاضی ہے۔ چنانچہ اب سے لگ بھگ پندرہ سال قبل بھی میں اپنی ایک تالیف ("استحکام پاکستان") میں اس پر مفصل بحث کر چکا ہوں۔ اور پھر اب سے چار پانچ سال قبل بھی میرے کچھ مضامین سلسلہ وار پاکستان کے ایک اہم قومی روزنامہ میں شائع ہوئے تھے جن میں میں نے ایک مختلف زاویے سے

اس مسئلے پر بحث کی تھی (یادش بخیر' میں نے ان مضامین میں سے ایک میں اپنی یہ کڑوی اور پاکستان کے معروضی حالات میں "ناگفتنی" رائے بھی پیش کر دی تھی کہ قائداعظم اصلاً سیکولر مزاج کے حامل تھے' جس کو نظریہ پاکستان کے اس عظیم ترین علمبردار اخبار نے شائع تو کر دیا تھا' البتہ اس پر ایک اختلافی نوٹ درج کر دیا تھا!) ـــــ تاہم اس وقت میں قیام پاکستان کے ضمن میں اپنی دو آراء کو اجمالاً بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

(۱) ایک یہ کہ پاکستان کا باپ تو (حضرت سلمان فارسیؓ کے قول کے مصداق) اسلام ہے' لیکن اس کی ماں جمہوریت ہے! اس لئے کہ بالفعل پاکستان کی ولادت ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے بطن سے ہوئی تھی ـــــ لیکن ان انتخابات کے نتیجے میں مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کی حیثیت اس نعرے کی بنیاد پر حاصل ہوئی تھی کہ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!"

(۲) تحریک پاکستان کے اصل عوامل دو تھے ـــــ ایک سلبی یا منفی یعنی ہندو کے غلبے اور اس کے استبدادی' استحصالی اور انتقامی طرز عمل کا "خوف" اور دوسرا مثبت اور ایجابی یعنی احیاءِ اسلام کی آرزو اور غلبۂ دینِ حق کی تمنا! چنانچہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۳۰ء تک رُبع صدی کے دوران تو مسلم لیگ کی ساری سوچ بچار اور تگ و دو صرف مقدم الذکر عامل ہی کے محور کے گرد گھومتی رہی تھی جس کا نقطۂ عروج تھے قائداعظم کے چودہ نکات ـــــ لیکن ۱۹۳۰ء کے تاریخی خطبہ الٰہ آباد کے ذریعے علامہ اقبال نے مسلم لیگ کی تحریک میں اس مثبت احیائی جذبے کا انجکشن بھی لگا دیا! چنانچہ اس کے بعد سے مسلسل سولہ سترہ سال تک تحریک مسلم لیگ کی رگوں میں یہ دونوں جذبے ﴿ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ○ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ○ ﴾ کی سی شان کے ساتھ بہتے رہے ـــــ اگرچہ ان دونوں کے مابین تاثیر کے اعتبار سے نسبت و تناسب کا معاملہ یہ رہا کہ اصل قوتِ محرکہ تو منفی ہی تھی یعنی اپنے قومی تشخص اور اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کے تحفظ کا جذبہ ـــــ تاہم پبلک اپیل کے لئے جس جذبے کو زیادہ INVOKE کیا گیا وہ تھا احیاءِ ملت اور غلبۂ اسلام کی آرزو کا مثبت اور مبارک جذبہ! جس کا صور علامہ اقبال نے تو اپنی رُبع صدی پر محیط ملی شاعری کے ذریعے زور و شور کے ساتھ پھونکا ہی تھا' اس میں ایک اضافی جوش و خروش ایک خاص دَور میں یعنی ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک مولانا ابوالکلام آزاد کے

"الہلال" اور "البلاغ" کے "حکومتِ الٰہیہ" کے نعرے سے پیدا ہو گیا تھا' جس کی صدائے بازگشت بعد میں دیر تک تحریک خلافت کی صورت میں سنی جاتی رہی! ـــــ بہرحال ان سب کا حاصل یہ کہ مسلم قومیت کا جذبہ ملت اسلامیہ ہند کے رگ و پے میں سرایت کر گیا' اور دو قومی نظریئے کو گویا مسلمانانِ ہند کے ایمان اور عقیدے کی حیثیت حاصل ہو گئی!

اس پس منظر میں آپ کا یہ فرمانا کہ "قیامِ پاکستان کے وقت ریاست اور مذہب کے تعلق کے حوالے سے ہمارے سامنے نظری طور پر تین راستے تھے" بہت محل نظر تھے۔ اس لئے کہ پاکستان ایک عظیم عوامی تحریک کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا اور یہ اس تحریک کی قوتِ متحرکہ (MOMENTUM) کے زیر اثر ایک خاص سمت میں حرکت پر مجبور تھا۔ اب اسے خواہ مشیت ایزدی سے تعبیر کر لیا جائے خواہ تاریخ کے جبر سے' بہرحال پاکستان صرف اسی سمت میں پیش قدمی کر سکتا تھا جسے آپ نے "تھرڈ آپشن" شمار کیا ہے ـــــ یعنی میری تعبیر کے اعتبار سے پاکستان کے باپ اور ماں' یعنی اسلام اور جمہوریت دونوں کے تقاضوں کو باحسن وجوہ پورا کرنے والے نظام کی جانب پیش قدمی! ـــــ جس کا آغاز بھی اس نے "قرارداد مقاصد" کی صورت میں کر دیا تھا! جس میں خود آپ کے بقول اسلام اور جمہوریت کا حسین امتزاج موجود تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ؎ "کچھ تو ہوتے بھی ہیں الفت میں جنوں کے آثار۔ اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں!" کے مصداق کچھ اپنوں کی غلطی' اور کچھ اغیار و اعداء کی ریشہ دوانیوں کے باعث پاکستان اس راہ پر آگے نہیں بڑھ سکا! تاہم اس موضوع پر گفتگو بعد میں ہو گی!!

سردست صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آپ نے تین راستوں میں سے جسے اولین' اور غالباً اپنا پسندیدہ ترین راستہ قرار دیا ہے اس کا عالم واقعہ میں سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اور وہ قابل ذکر اور لائق التفات و اعتناء بھی صرف اس لئے ہے کہ وہ قائداعظم کی ۱۱/ اگست ۴۷ء والی تقریر میں بیان ہوا تھا جس کا بہت مفصل اقتباس آپ نے دیا ہے۔ ورنہ پاکستان کے معروضی حالات میں اس سے زیادہ غیر منطقی اور "آنہونی" بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی! اس لئے کہ آپ کو جو معروضی حقائق آج کے پاکستان میں نظر آ رہے ہیں وہ ان سے کہیں زیادہ گھمبیر صورت میں قیامِ پاکستان کے وقت بھی موجود تھے ـــــ

آج اگر آپ کو پاکستان کے مذہبی عناصر کی ایک "پریشر گروپ" کی حیثیت سے قوت و طاقت کا اعتراف ہے' تو اُس وقت بھی وہ نہایت مؤثر و فعال مذہبی عناصر موجود تھے جنہوں نے تحریکِ پاکستان کے آخری اور فیصلہ کن ایام میں بھرپور اور حد درجہ فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ بلکہ آج کے حالات کے بارے میں تو آپ کا یہ مشاہدہ درست ہے کہ عوام میں مذہبی اُمنگ اور ولولہ بہت کم ہو گیا ہے اُس وقت تو عوام کی عظیم اکثریت بھی مذہبی ولولوں اور امنگوں سے سرشار تھی! اندریں حالات قائداعظم کے یہ "ناگہانی" خیالات و فرمودات بالکل انگریزی محاورے "BOLT FROM THE BLUE" کے سے انداز میں صادر ہوئے تھے ــــــ اور مولانا مودودی کا جو تاریخی جملہ آپ نے قراردادِ مقاصد کے متعلق نقل فرمایا ہے وہ بالکل اسی انداز میں قائداعظم کے ان فرمودات پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

قائداعظم کے ان فرمودات کی توجیہہ و تاویل میں' اس سے قطع نظر کہ ان کو جماعت اسلامی اور اس کے ہم خیال لوگوں نے بقول آپ کے کس طرح توڑا مروڑا' خود قائداعظم کے مخلص ترین ساتھیوں اور گہری عقیدت و محبت کے حامل لوگوں کو بھی بہت دقت پیش آئی ہے۔ یہاں تک کہ چوہدری غلام احمد پرویز' جو آخری دم تک کٹر مسلم لیگی اور علامہ اقبال اور قائداعظم دونوں کے عاشق و شیدائی رہے' یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کے حالات کی سنگینی یعنی وسائل کے فقدان اور مہاجرین کے طوفان کے باعث قائداعظم کے اعصاب متاثر ہو گئے تھے ــــــ اور اسی اعصابی دباؤ کے عالم میں یہ الفاظ نادانستہ طور پر قائداعظم کی زبان یا قلم سے صادر ہو گئے ــــــ تاہم میری رائے یہ ہرگز نہیں ہے ــــــ میرے نزدیک یہ قائداعظم کی سوچی سمجھی رائے تھی اور میرے پاس ان کے ان فرمودات کی ان کی عظیم شخصیت کے شایانِ شان تاویل بھی موجود ہے ــــــ تاہم یہ بات تھی بالکل اَنہونی اور قطعاً ناقابلِ عمل!

قائداعظم کے ان فرمودات کا یہ مفہوم لینا تو قطعاً غلط ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے اعلانات اور وعدوں سے منحرف ہو گئے تھے۔ میرے نزدیک قائداعظم اگرچہ کوئی "مذہبی" انسان تو نہ تھے لیکن نہایت سچے اور کھرے اور ہر اعتبار سے مضبوط کردار کے حامل شخص تھے' لہٰذا ان کے بارے میں گندم نمائی اور جو فروشی کا گمان بھی

ہرگز نہیں کیا جا سکتا ـــــ البتہ یہ صحیح ہے کہ ان کے نزدیک نظامِ اسلامی کے قیام سے اصل مراد اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام تھا (جہاں تک عقائد و عبادات کا تعلق ہے ان کے ضمن میں تو نہ برٹش انڈیا میں کوئی قدغنیں تھیں نہ آج کے بھارت میں ہیں' اور نہ ہی پوری مغربی دنیا میں کہیں پائی جاتی ہیں!) اور ان کی رائے یہ تھی کہ اب جبکہ ایک ایسا ملک قائم ہو گیا ہے جس میں مسلمان عظیم اکثریت میں ہیں تو اس میں اسلامی نظام کا قیام ان خالص سیکولر اصولوں کے مطابق بھی ممکن ہے جو اس وقت پوری دنیا میں مروج ہیں' یعنی عوام کی اکثریت کی منشا اور مرضی کے مطابق فیصلہ اور قانون سازی! (جبکہ ظاہر ہے کہ اگر بھارت "اکھنڈ" رہتا تو ایسا امکان کبھی بھی قرین قیاس نہیں ہو سکتا تھا!) اندریں حالات اس کی کیا ضرورت ہے کہ آغاز ہی میں اسلام کا نقارہ بجا کر پوری دنیا کو خبردار کر دیا جائے اور اس طرح ابلیسی قوتوں کے ایوانوں میں کھلبلی مچا دی جائے۔

البتہ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ قائداعظم کے ان فرمودات سے دو قومی نظریئے' اور مسلم قومیت کے تصور کی نفی ضرور ہو گئی تھی ـــــ جس کی سادہ ترین تعبیر جناب ایس ایم ظفر نے اپنے اس جملے میں کر دی ہے کہ: "میرے نزدیک دو قومی نظریہ ۱۴/ اگست ۴۷ء کو دفن ہو گیا تھا!" (یادش بخیر' کاش کہ آج جناب زیڈ اے سلہری زندہ ہوتے اور ظفر صاحب کی بھرپور سرزنش اپنی پوری بزرگانہ شان سے کرتے!) ـــــ اور یہی میرے نزدیک حضرت قائداعظم کے ان فرمودات کے ناممکن العمل ہونے کی اصل وجہ ہے۔ اس لئے کہ کسی فرد کے لئے تو یہ آسان ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے اپنے نظریئے اور عمل کے رُخ کو بدل لے' لیکن تحریکوں اور جماعتوں' اور ان سے بھی بڑھ کر قوموں اور ملکوں کے لئے ایسا کرنا ہرگز آسان نہیں ہوتا۔ چنانچہ جو بات آپ نے مولانا مودودی کے بارے میں لکھی ہے وہ خود قائداعظم پر بھی صدفی صد راست آتی ہے ـــــ یعنی جس طرح مولانا مودودی پر ۵۰ء سے ۷۰ء تک پورے بیس برس جماعت اسلامی کو ملکی انتخابات میں حصہ لینے کی پالیسی پر بالفعل چلانے اور کارکنوں کو دلائل و براہین سے مطمئن رکھنے کے بعد ۷۰ء کے انتخابات کے نتیجے میں دفعتاً یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اس راہ سے کسی خیر کی توقع نہیں ہے' اور انہوں نے جماعت کا رُخ بدلنا چاہا تو جماعت کی قیادت کی صف دوم نے بات ماننے سے صاف انکار کر دیا اور ایک روایت کے مطابق مولانا مرحوم

بھنا کر یہ کہتے ہوئے شوریٰ کے اجلاس سے روانہ ہو گئے کہ: "آج جو دلیلیں آپ لوگ میرے سامنے پیش کر رہے ہیں یہ سب میں نے ہی آپ لوگوں کو بجھائی تھیں' لیکن اب میری رائے وہ ہے جو میں نے پیش کر دی' آگے آپ جانیں اور آپ کا کام!" ـــــ اسی طرح غور فرمایئے کہ نصف صدی تک مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا راگ الاپتے رہنے' ـــــ اور بالخصوص ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء دس سال کے دوران تو دو قومی نظریئے اور مسلم قومیت کے اصول پر ایک عظیم عوامی تحریک چلانے اور اسی اصول کے مطابق ہندوستان کی تقسیم کرا کے پاکستان قائم کرا لینے کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ راتوں رات اس نئے ملک اور قوم کے رُخ کو متحدہ وطنی قومیت کی جانب موڑ دیا جاتا! ـــــ یہاں جی چاہتا ہے کہ حضرت قائداعظم کے اس خیال پر وہی تبصرہ کروں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک اقدام پر کیا تھا ـــــ یعنی: ﴿ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰهَا ﴾ یعنی جس طرح حضرت یعقوبؑ اپنی اس تدبیر کے ذریعے اپنے بیٹوں کو اللہ کی کسی تقدیر سے بچا نہیں سکتے تھے' مگر بس ایک خیال تھا جو ان کے جی میں آیا اور انہوں نے اسے پورا کر لیا' اسی طرح قائداعظم کے لئے بھی دو قومی نظریئے کے طاقتور MOMENTUM کے رُخ کو دفعتاً بدلنا تو ممکن نہ تھا' البتہ یہ ایک خیال تھا جو ان کے ذہن میں آیا جسے انہوں نے پیش فرما دیا ـــــ اور بس!!!

رہا یہ خیال کہ اگر قدرت قائداعظم کو مہلت دیتی اور ان کی زندگی کچھ مزید وفا کرتی تو عین ممکن تھا کہ وہ اپنی پوری شخصیت کے وزن کو استعمال کرتے ہوئے اس نئے رُخ پر سلطنت کی گاڑی کو بالفعل چلا کر ایک نیا MOMENTUM پیدا کر دیتے ـــــ تو اگرچہ واقعتاً اس کا پورا امکان موجود ہے ـــــ تاہم اس امکان کی بھی مطلق نفی ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ اس صورت میں خود قائداعظم کی شخصیت "متنازعہ" بن جاتی! واللہ اعلم!!

رہا "قراردادِ مقاصد" کے بارے میں جسٹس منیر صاحب کا بچگانہ بلکہ احمقانہ قول کہ خان لیاقت علی خان نے اس قرارداد کو قائداعظم کے انتقال کے انتظار میں اپنے نہاں خانۂ قلب میں چھپائے رکھا ـــــ تو حیرت اس پر ہوئی کہ آپ نے اس کا حوالہ ایک ثقہ رائے کی حیثیت سے کیسے دے دیا۔ جبکہ واقعہ تو اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ خود خان لیاقت علی خان بھی قائداعظم ہی کی طرح ایک خالص لبرل اور سیکولر مزاج کے حامل

انسان تھے' اور قرار دادِ مقاصد ان کے اپنے دل کی آواز تھی ہی نہیں ـــــ یہ تو ان پر تحریک پاکستان کے اس MOMENTUM کے حوالے سے ٹھونسی گئی تھی ـــــ جس کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کی سکت اُس وقت کسی میں نہیں تھی۔ ذرا غور فرمائیں کہ کیا یہ معجزہ نہیں ہے کہ اس کے باوجود کہ مولانا مودودی نے قرار دادِ پاکستان کے منظور ہونے کے فوراً بعد اپنا راستہ مسلم لیگ سے علیحدہ کر لیا تھا اور تحریک پاکستان کے آخری ایام میں تو مسلم لیگ اور اس کی قیادت پر شدید تنقیدیں بھی کی تھیں' لیکن قیام پاکستان کے فوراً بعد جب وہ دستورِ اسلامی کا مطالبہ لے کر سامنے آئے تو پوری قوم نے ان کی تائید کی۔ یہاں تک کہ مسلم لیگ کے ان عناصر نے جو کسی قدر مذہبی مزاج کے حامل اور کم از کم صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اور جن میں زیادہ بڑی تعداد مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ارکانِ دستور ساز اسمبلی کی تھی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں قرار دادِ مقاصد کی منظوری میں فیصلہ کن رول ادا کیا ـــــ اس ضمن میں آپ نے مسلم لیگی قیادت کی اس نااہلی کا ذکر تو کئی بار کیا ہے کہ وہ مذہبی حلقوں کے استدلال کا مؤثر جواب نہ دے سکی لیکن اس کا سبب بیان نہیں کیا۔ جو اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ "خود کردہ را علاجے نیست!" کے مصداق آخر وہ اس عوامی جوش و خروش کا مواجہہ کس منہ سے کرتی جسے خود اس نے شدید محنت و مشقت سے پیدا کیا تھا! ـــــ مسلم لیگ کے کچھ دانشور قسم کے قائدین نے آئیں بائیں شائیں کے انداز میں "کونسا اسلام؟" اور "کس فرقے کا اسلام؟" قسم کے سوالات سے اس عوامی رو کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی بھی تو ۵۰ء میں (قرار دادِ مقاصد کی منظوری کے ایک ہی سال بعد) تمام مکاتب فکر اور جملہ مسالک کے ۳۱ علماء نے دستور کے ضمن میں ۲۲ متفق علیہ نکات پیش کر کے اس غبارے سے بھی ہوا نکال دی!

الغرض' ع "خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ" کے مصداق ﴿اَلْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ﴾ نے ﴿فِیْ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ﴾ کے مطابق تحریک پاکستان میں جو اجزائے ترکیبی ودیعت کر دیئے تھے ان کا واحد منطقی اور قطعی طور پر لازمی و لابدی نتیجہ وہی تھا جسے آپ نے "تھرڈ آپشن" قرار دیا ہے' یعنی اسلام اور جمہوریت کا امتزاج! جس کے مظہر اول کی حیثیت تھی قرار دادِ مقاصد کو اور مظہر ثانی تھا ۵۶ء کا دستور! ـــــ اس لئے کہ سیکولر ڈیماکریسی پاکستان میں اس لئے ناقابل عمل تھی کہ یہ اس کے "باپ" یعنی

اسلام کے منافی تھی، تو کسی بھی قسم کی تھیاکریسی بھی یہاں ناقابل تصور تھی، اس لئے بھی کہ یہ اس کی "ماں" یعنی جمہوریت کی نفی کرتی ہے اور اس لئے بھی کہ یہاں کوئی مذہبی پیشوائیت (RELIGIOUS HIERARCHY) بھی کسی منظم اور مربوط صورت میں موجود نہیں تھی!!

اب ذرا اس مسئلے پر بھی مختصر گفتگو ہو جائے کہ پاکستان اسلام اور جمہوریت کے اس حسین امتزاج کے رُخ پر فیصلہ کن انداز میں کیوں پیش قدمی نہ کر سکا جس کا آغاز قرار دادِ مقاصد سے ہوا تھا۔ تو جیسے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اس کے دو اسباب تھے، ایک اپنی یا اپنوں کی غلطی، اور دوسرے اغیار و اعداء کی سازش۔ چنانچہ اپنی یا اپنوں کی غلطی تو یہ تھی کہ مولانا مودودی "انقلابِ قیادت" کا نعرہ لگا کر مسلم لیگی قیادت کے مدمقابل بن کر سامنے آ گئے اور اس حیثیت سے انہوں نے ۱۹۵۱ء کے انتخاباتِ پنجاب کے میدان میں چھلانگ لگا دی ـــــ جس کے نتیجے میں اسلام اب پوری قوم کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ ایک سیاسی جماعت کا پارٹی ایشو بلکہ انتخابی نعرہ بن کر رہ گیا۔ اور اگرچہ اس پہلے معرکے میں جماعت اسلامی چاروں شانے چت آئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ اپنے طریق کار کے ضمن میں ترمیم در ترمیم پر عمل کرتے ہوئے پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس راہ پر گامزن رہی، خواہ نتیجہ، سوائے ایک خاص دور میں کراچی کے بلدیاتی الیکشن کے، ہمیشہ ڈھاک کے تین پات ہی کے مصداق رہا ـــــ لیکن کچھ عرصہ بعد دوسری مذہبی جماعتیں بھی اس خیال سے اس میدان میں داخل ہوتی چلی گئیں کہ ؎ "کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب۔ آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!" جس کے نتیجے میں متعدد اسلام ایک دوسرے کے مقابل میں آ گئے جس کے نتیجے میں فرقہ واریت میں شدت اور تلخی بڑھتی چلی گئی! ـــــ گویا جتنا بڑا صحیح اقدام یہ تھا کہ عوامی دباؤ کے تحت اس ملک کی گاڑی کو اسلام کی سمت میں دھکیلا جائے، اتنی ہی بڑی ہمالیہ ایسی غلطی یہ تھی کہ اسلام کے علمبردار اور نام لیوا خود طالب اقتدار بن کر پاور پالیٹکس یعنی کشاکشِ اقتدار کے اکھاڑے میں اتر گئے!

اس سب کے علی الرغم جب ۱۹۵۶ء کے دستور میں قابل لحاظ اسلامی دفعات شامل ہو گئیں تو اب مرئی اور غیر مرئی ابلیسی قوتوں نے سازش کا جال پھیلایا، اس لئے کہ شیطان لعین نے اپنی صلبی اور معنوی اولاد کے ذریعے صدیوں کی منصوبہ بندی اور سر توڑ

جدّوجہد کے ذریعے لادین اور بے خدا سیاست' سود اور جوئے پر مبنی معیشت' اور مخلوط اور حیاسوز معاشرت کی جو بساط بچھائی تھی' پاکستان کی اسلامی ریاست کی جانب پیش قدمی اس کے خلاف بہت بڑے چیلنج بلکہ ایک حالیہ اصطلاح کے مطابق "پہلے بڑے پتھر" کی حیثیت رکھتی تھی ـــــ چنانچہ عالمی صیہونی تحریک کے آلۂ کار WASP یعنی "WHITE ANGLO-SAXON PROTESTANTS" کے سرخیل امریکہ بہادر نے افواجِ پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان کو امریکہ بلا کر ان کی پشت پر کوئی ایسا ہاتھ پھیرا کہ انہوں نے دستور کے ساتھ ساتھ دستوریہ کی بساط بھی لپیٹ کر رکھ دی اور مارشل لاء نافذ کر دیا۔ (یاد ہو گا کہ اسی کا ایک ایکشن ری پلے حال ہی میں پاکستان میں ہوتے ہوتے رہ گیا' جب سابق چیف آف آرمی اسٹاف جنرل کرامت صاحب کو خصوصی دعوت پر امریکہ بلایا گیا اور انہیں وہاں نہایت غیر معمولی پروٹوکول دیا گیا ـــــ جس کا نتیجہ نیشنل ڈیفنس کونسل کی تجویز کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ جنرل ایوب خان کے زمانے میں ملک میں سیاسی ابتری کی کیفیت تھی اور اِس وقت ملک پر ایک ایسے شخص کی حکومت ہے جو بالکل ﴿لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا﴾ کے سے انداز میں اپنے اقتدار و اختیار میں کسی کو بھی ساجھی بنانے پر آمادہ نہیں' حتیٰ کہ اس نے خود اپنے بھاری مینڈیٹ کے جن کو بھی آہنی زنجیروں میں خوب جکڑ کر رکھا ہوا ہے!) ـــــ بہرحال ۵۸ء کے بعد کے چالیس سالوں کے دوران پاکستانی سیاست میں جو اتار چڑھاؤ آتے رہے ان کے بین السطور یہ کشاکش بھی مسلسل چلتی رہی یا بالفاظ دیگر یہ "معرکۂ روح و بدن" پیہم برپا رہا کہ ؎ "ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر۔ کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!" کے مصداق ایک جانب عالمی بے خدا تہذیب کا دباؤ اور پاکستان کے مقتدر (ELITE) طبقات جو اس تہذیب کے مریدانِ باصفا تھے اس ملک کو سیکولرزم کی جانب کھینچتے رہے' تو دوسری جانب تحریک پاکستان کی بچی کھچی اندرونی قوتِ متحرکہ اور مذہبی جماعتوں کا مجموعی اثر و رسوخ مزاحمت کرتے رہے ـــــ جس کا نتیجہ ایک جمود (STALEMATE) کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جس کے مضر اثرات لامحالہ طور پر ہماری اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں اور پہلوؤں پر مترتب ہوئے!

ان حالات میں آپ کا یہ انتباہ بہت بروقت ہے کہ "اگر ہم پاکستان کو صحیح معنوں میں

ایک جدید اسلامی، روشن خیال، معاصر تقاضوں سے ہم آہنگ، جمہوری فلاحی مملکت بنانے میں ماضی کی طرح حال اور مستقبل میں بھی ناکام رہتے ہیں تو لوگوں کے لئے قیامِ پاکستان کا جواز سمجھنا روز بروز مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جائے گا!" ـــــ لیکن اس ضمن میں سب سے اہم اور عملی اعتبار سے مشکل ترین سوال تو یہ ہے کہ اس کے لئے کون اور کس طریق پر جدوجہد کرے؟۔ لیکن اس سے پہلے بھی اور غالباً اس سے بھی کہیں زیادہ مشکل سوال یہ ہے کہ اسلام کی سرمدی اور ابدی تعلیمات کے ساتھ جمہوریت کی جدید ترین اور بلند ترین اقدار ـــــ اور قدیم اصولوں کے ساتھ جدید اداروں کی پیوند کاری کس طریقے اور کس نسبت و تناسب سے ہو؟۔

اس سلسلے میں آپ نے اپنی اس تحریر میں جو STRAY اشارات کئے ہیں ان سے کوئی مکمل نقشہ تو نہیں بنتا تاہم سوچ کا ایک رُخ ضرور سامنے آیا ہے۔ اسی رُخ پر قدرے زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اور کسی قدر "فاش تر" انداز میں ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب بھی لکھتے رہے ہیں۔ مستقبل کی اسلامی ریاست کے ضمن میں اس سے بالکل مختلف بلکہ برعکس ہے وہ نقشہ جو اکثر و بیشتر مذہبی لوگوں کے ذہنوں میں پایا جاتا ہے، یعنی ازمنۂ وسطیٰ کی کوئی حکومت جس میں اختیار و اقتدار کلی طور پر کسی "سلطان" کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور دائرۂ مشاورت کی وسعت زیادہ سے زیادہ "اربابِ حل و عقد" تک محدود ہوتی تھی۔

اس موضوع پر میں نے اپنے خیالات نہایت اختصار کے ساتھ اب سے لگ بھگ دو اڑھائی سال قبل لاہور کے امریکن قونسلیٹ کے پولیٹیکل آفیسر مسٹر جیمس ایف کول کے سامنے جن الفاظ میں بیان کئے تھے، جو خاص اس موضوع پر گفتگو کے لئے تشریف لائے تھے، وہ آپ کے سامنے رکھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

مسٹر کول نے جب مجھ سے سوال کیا کہ آپ پاکستان میں خلافت کا جو نظام قائم کرنا چاہتے ہیں اس کا دستوری اور آئینی ڈھانچہ کیا ہوگا ـــــ تو میں نے عرض کیا کہ آپ اپنا امریکی دستور لے لیں اور اس میں صرف تین چیزیں شامل کر لیں تو اس طرح عہدِ حاضر کے بہترین نظامِ خلافت کا دستورِ اساسی وجود میں آجائے گا۔ اس پر ابتداء میں تو انہوں نے شک آمیز حیرت کا اظہار کیا، لیکن میری وضاحت کے بعد وہ مطمئن ہو گئے اور انہوں نے

اعتراف کیا کہ آپ کی بات بالکل واضح ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ میں نے امریکی دستور کی بات صرف اس لئے نہیں کی تھی کہ میں ایک امریکی سے گفتگو کر رہا تھا بلکہ اصلاً اس لئے کی تھی کہ میرے نزدیک جدید جمہوری ریاست کے دستوری و آئینی ارتقاء ـــــ اور اس کے لئے بنیادی اداروں کی تعیین و تشکیل کا جو عمل مغرب میں انقلابِ فرانس سے شروع ہوا تھا ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ریاستی ڈھانچہ اس کے بلند ترین مقام (CLIMAX) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں جہاں ایک جانب ریاست کے تینوں اساسی اداروں میں سے ہر ایک کو "بے ہمہ" بھی قرار دیا گیا ہے' یعنی دوسرے دونوں سے آزاد اور مستقل بالذات' اور اس جہت سے "باہمہ" بھی کہ وہ بقیہ دونوں کے ساتھ مربوط ہے ـــــ مزید برآں ان تینوں کے مابین حد درجہ توازن بھی پیدا کر دیا گیا ہے ـــــ اور دوسری جانب اختیارات کو کسی ایک جگہ مرکوز کرنے کی بجائے روحِ عصر کے عین مطابق کاؤنٹی کی سطح تک پہنچا دیا گیا ہے ـــــ!

امریکی دستور میں مَیں نے جن تین چیزوں کے شامل کئے جانے کا ذکر کیا ان میں سے پہلی تو وہ تھی جو ہمارے یہاں' بحمد اللہ' ۱۹۴۹ء سے طے ہے ـــــ یعنی یہ کہ "سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے۔ حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری!" کے مصداق اس امر کا صریح اعلان کہ یہاں حاکمیت مطلقہ عوام کی نہیں خدا کی ہے ـــــ یہ چیز چونکہ ہمارے مابین متفق علیہ ہے لہٰذا اس پر مزید گفتگو کی کوئی ضرورت نہیں ہے!

دوسری بات جو میں نے عرض کی تھی وہ یہ کہ یہ طے کر دیا جائے کہ یہاں کسی بھی سطح پر کوئی بھی قانون سازی خدا کی کتاب اور اس کے رسول ؐ کی سُنّت کے خلاف نہیں کی جا سکے گی۔ یہ معاملہ بھی ہمارے دستور میں دفعہ ۲۲۷ کے تحت موجود تو بہت عرصہ سے ہے لیکن یہ دفعہ بالکل غیر مؤثر اور کسی قوتِ نافذہ (SANCTION) کے بغیر تھی' تا آنکہ ۱۹۸۰ء میں جنرل ضیاء الحق مرحوم نے اسے فیڈرل شریعت کورٹ کے ذریعے متحرک اور مؤثر کیا تھا۔ لیکن کلی طور پر نہیں بلکہ جزوی طور پر بہت سے استثناءات کے ساتھ ـــــ لیکن اگر یہ دفعہ واقعی مؤثر بن جائے تو بھی اس کے ضمن میں دو مسائل ایسے ہیں جن کے بارے میں ہماری قوم اور معاشرے میں بہت مختلف آراء موجود ہیں' یعنی

ایک یہ کہ قرآن اور سنّت کی قانونی حیثیت کیا ہے' اور دوسرے یہ کہ یہ فیصلہ کرنے کا اختیار کس کو ہو گا کہ کسی معاملے میں قرآن اور سنّت سے تجاوز ہو گیا ہے یا نہیں۔

ان میں سے مقدم الذکر مسئلے کے بارے میں تو میں اِس وقت کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے بھی کہ یہ ایک بہت مفصل بحث کا متقاضی ہے' ـــــ اور اس لئے بھی کہ اُمت کی عظیم ترین اکثریت اس پر قطعی طور پر متفق ہے کہ قرآن حکیم تو کُل کا کُل یعنی نہ صرف عمومی اُصول بلکہ جملہ معین احکامات سمیت واجب التنفیذ ہے ہی' سنّت رسولؐ بھی قانون اسلامی کا قرآن پر مستزاد' اور مستقل بالذات ماخذ ہے ـــــ چنانچہ بحمد اللہ پاکستان کے دستور میں بھی یہ حقیقت دفعہ ۲۔الف اور دفعہ ۲۲۷ میں واضح طور پر ثبت ہے۔ (اس مسئلے کے ضمن میں چونکہ آپ نے بھی اپنی بعض آراء کا' خواہ بر سبیل تذکرہ ہی سہی' ذکر کیا ہے لہٰذا اگر آپ کے نزدیک میرے یہ خیالات قابل توجہ اور لائق اشاعت ہوئے تو' ان شاءاللہ' جلد ہی اس موضوع پر بھی تفصیلی گزارشات پیش کروں گا۔)

البتہ مؤخر الذکر معاملے میں یہ گزارش ضروری ہے کہ یہ خالص فنی معاملہ کہ کسی مسئلے میں قرآن اور سنّت کی حدود سے تجاوز ہو گیا ہے یا نہیں موجودہ دنیا کے معروف اور مسلمہ طریقے کے مطابق اعلیٰ عدلیہ کے حوالے ہونا چاہئے' جہاں علماء کرام بھی پیش ہو کر اپنی آراء اور ان کے ضمن میں دلائل پیش کر سکیں گے۔ اور عوام میں سے بھی جو بھی اپنے آپ کو رائے دینے کا اہل گردانے اسے حق حاصل ہو گا کہ اپنی بات کہہ سکے ـــــ اس ضمن میں اس سے تو ہرگز اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ اگر یہ اختیار علماء کے کسی بورڈ کے حوالے کر دیا جائے تو اس سے ایک نوع کی تھیاکریسی وجود میں آئے گی۔ (جیسی کہ اس وقت ایران میں ہے!) ـــــ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اتنی ہی غلط بات یہ ہو گی کہ یہ فیصلہ کلی طور پر پارلیمنٹ پر چھوڑ دیا جائے ـــــ خواہ اس کے ارکان کی اکثریت قرآن اور سنّت کے علم سے نابلد محض ہو۔ نظری اعتبار سے یہ اختیار پارلیمنٹ کے حوالے صرف اس صورت میں کیا جا سکتا ہے کہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے عالم دین ہونے کی شرط عائد کر دی جائے ـــــ جس سے ریاست کا جمہوری قاعدہ (BASE) سکڑ کر بہت محدود ہو جائے گا۔ صحیح تر راہ یہی ہے کہ پارلیمنٹ کی نمائندہ حیثیت وسیع سے وسیع تر ہو' اور قانون سازی کا اختیار بھی اصلاً اسی کے ہاتھ میں ہو' البتہ چونکہ یہ دستور میں درج ہو گا کہ یہاں

کوئی قانون سازی کتاب و سُنّت کے منافی نہیں کی جاسکتی اور دستور کی محافظ و امین (CUSTODIAN) اعلیٰ عدلیہ (HIGHER JUDICIARY) ہی ہوتی ہے لہٰذا ہر شہری کو یہ حق دیتے ہوئے کہ اگر اس کی رائے میں کسی موجودالوقت قانون' یا نئے پاس ہونے والے یا زیر تجویز قانون میں کوئی بات کتاب و سُنّت کے منافی ہے تو وہ عدالت کے در پر دستک دے سکے' آخری فیصلہ عدالت پر چھوڑ دیا جائے۔

اس ضمن میں میرے نزدیک پاکستان میں اولاً علماء بورڈ ـــــ پھر اسلامی نظریاتی کونسل اور آخر میں فیڈرل شریعت کورٹ کا قیام صحیح رُخ پر ارتقاء کی منزلیں ہیں ـــــ جس کی آخری منزل یہ ہوگی کہ جب ہمارے سارے لاء کالج "کلیۃ الشریعہ" بن جائیں گے اور سارے ہی جج ماہرین کتاب و سُنّت ہوں گے تو اس کام کے لئے کسی علیحدہ فیڈرل شریعت کورٹ اور سپریم کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بنچ کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ کام ریگولر عدالت ہائے عالیہ اور عدالت عظمیٰ ہی کے ذریعے ہوگا!

امریکہ کے ریاستی ڈھانچے کو نظامِ خلافت میں تبدیل (CONVERT) کرنے کے لئے جو تیسری چیز میں نے مسٹر کول کے سامنے رکھی تھی' اس کا موجودالوقت ظروف و احوال اور ذہنی و نفسیاتی فضا میں ہضم ہونا تو درکنار نگلنا بھی بہت مشکل ہے' تاہم اس کے باوجود کہ پاکستان کے معروضی حالات میں اس کی کوئی عملی اہمیت نہیں ہے اور اس کے ضمن میں کامل سکوت اختیار کیا جاسکتا ہے' دیانت کا تقاضا ہے کہ اسے بیان کر دیا جائے ـــــ یعنی یہ کہ اسلامی ریاست میں کامل شہریت صرف مسلمانوں کو حاصل ہوتی ہے' غیر مسلموں کی حیثیت محفوظ و مصئون اقلیت (PROTECTED MINORITY) کی ہوتی ہے! ـــــ چنانچہ جہاں تک جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت' عقیدے اور عبادت کی آزادی اور مقدس مقامات کی حفاظت' پرسنل لاء یعنی اکل و شرب کے معمولات' شادی بیاہ کے قوانین اور رسومات' اور وراثت کے قواعد و ضوابط' وغیرہ کا تعلق ہے ان کے ضمن میں تو غیر مسلموں کو بھی مسلمانوں کے بالکل برابر حقوق حاصل ہوں گے ـــــ اسی طرح تجارت اور صنعت و حرفت کے علاوہ مختلف پیشوں' اور سول اور فوجی ملازمتوں کے دروازے بھی ان پر مسلمانوں ہی کی طرح کھلے ہوں گے ـــــ لیکن دو امور میں انہیں شریک نہیں کیا جاسکتا' یعنی ایک عام انتظامی قواعد و ضوابط سے قطع نظر بلند ترین سطح

کی قانون سازی میں جس میں تحلیل و تحریم یعنی کسی شے کی حلت و حرمت اور حدود کا معاملہ INVOLVED ہو' اس لئے کہ ان کا منبع قرآن و سنّت ہیں جنہیں غیر مسلم تسلیم ہی نہیں کرتے' اور دوسرے ریاست کی اعلیٰ ترین سطح کی پالیسی سازی میں' اس لئے کہ اسلامی ریاست کی اولین اور بلند ترین ترجیح (PRIORITY) یہ ہو گی کہ اللہ کے دین کا پوری دنیا میں بول بالا ہو اور پورا عالم انسانیت رحمۃٌ لِلعالمین کے سایۂ رحمت میں آ جائے۔ جبکہ کسی غیر مسلم سے اس کی خواہش یا آرزو کی توقع نہیں کی جا سکتی!

اس رائے پر آپ نے اپنی تحریر میں خود بھی "بوالعجبی" کی پھبتی چست کی ہے' اور پھر بھارتی مسلمانوں کے مسئلے اور اس کے ضمن میں منیر کمیشن رپورٹ کے حوالوں کو "برہانِ قاطع" کے طور پر پیش کیا ہے' تاہم ان مسائل پر گفتگو کا اس وقت موقع نہیں ہے۔ چند سال قبل امریکہ کے سفر کے دوران کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر اقبال احمد صاحب کے ساتھ ہم سفری اور گفتگو کا موقع ملا۔ تو جب انہوں نے بالکل اسی انداز سے بھارتی مسلمانوں کا مسئلہ اٹھایا تو اس پر جو کچھ میں نے عرض کیا تھا اس پر ان کا تبصرہ یہ تھا کہ "آپ کی باتیں قابلِ غور ہیں' اور آپ سے مزید گفتگو ہونی چاہئے!" ـــــ بہرحال اس وقت تو میں ایک بیرونی سفر کے لئے پابہ رکاب ہوں' ان شاء اللہ واپسی پر اس موضوع پر تفصیلاً لکھوں گا!

سردست کہنا صرف یہ ہے کہ عہد حاضر میں اسلامی ریاست کا بہترین دستوری اور آئینی ڈھانچہ' جس میں اسلام کے ساتھ جمہوریت کی اعلیٰ ترین اقدار کو سمو دیا جائے اس طرح وجود میں آ سکتا ہے کہ انسان نے گزشتہ دو اڑھائی سو سالوں کے دوران جمہوری ریاست کے دستوری اور آئینی ارتقاء کے جو ثمرات حاصل کئے ہیں' اور جن اداروں کی تشکیل کی ہے' ان میں سے بہترین کو اختیار کر کے صرف متذکرہ بالا تین چیزیں شامل کر دی جائیں!

البتہ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ میں مغرب کی جس یافت کو قابل قدر اور رفیع قرار دے رہا ہوں' وہ اس کا پورا سماجی' اقتصادی اور سیاسی نظام نہیں ہے' بلکہ صرف جمہوری ریاستی ڈھانچہ یا اگر ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت ہو تو "STATE-CRAFT" ہے ـــــ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے بارے میں

جو پیشینگوئی علامہ اقبال نے ستر اسّی سال قبل کی تھی وہ کبھی کی پوری ہو چکی' اور وہاں کا خاندانی نظام اور جملہ سماجی اقدار عرصہ ہوا کہ "اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی" کر چکیں۔ اسی طرح مغرب کا اقتصادی نظام بھی بدترین استحصالی نظام کا مظہر ہے ـــــ اور واقعہ یہ ہے کہ فوکویاما نے سوویٹ یونین کا شیرازہ بکھرنے پر مغربی نظام کے بارے میں جو بڑ کیں ماری ہیں' ان کے بالکل برعکس حقیقتاً یہ نظام بالکل کھوکھلا ہو چکا ہے' اور اب اگر قائم ہے تو صرف ہائی ٹیکنالوجی کی بنیاد پر جو ایک جانب اسے ناقابل تسخیر فوجی طاقت بنائے ہوئے ہے' اور دوسری جانب پوری تیسری دنیا کے عوام کا خون کھینچ کر وہاں پہنچا دیتی ہے!

بہرحال پاکستان اگر حقیقی معنی میں اسلامی' جمہوری' فلاحی سلطنت بنتا ہے تو علامہ اقبال اور قائداعظم کے خوابوں کی تعبیر بن کر پورے عالم انسانیت کے لئے ایک منارۂ نور کا کام دے گا ـــــ ورنہ اپنی معنویت تو تقریباً کھو ہی چکا ہے' حقیقی اندیشہ موجود ہے کہ اپنا وجود بھی کھو بیٹھے! (معاذ اللہ!)

مراحل انقلاب کے نقطہ نگاہ سے سیرتِ مطہرہ کا ایک منفرد مطالعہ

اسلامی انقلاب کیلئے سرگرم عمل افراد کیلئے مشعل راہ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ' کے گیارہ خطبات پر مشتمل کتاب

منہج انقلابِ نبویؐ

کا نیا ایڈیشن' جو حسن ظاہری ہی نہیں حسن معنوی کے اعتبار سے بھی

سابقہ ایڈیشن پر فوقیت رکھتا ہے' چھپ کر آ گیا ہے

دیدہ زیب کمپیوٹر کمپوزنگ' عمدہ طباعت' چار رنگوں میں شائع شدہ خوبصورت سرورق'

صفحات : 376 قیمت مجلد : 160 روپے ' غیر مجلد : 140 روپے

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور

انقلاب کا نبویؐ منہاج

تحریر : محمد رشید عمر، فیصل آباد

اقامت دین کا طریق کار کیا ہونا چاہئے؟ یہ وہ سوال ہے جس کے لئے امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ملک بھر میں منہاجِ محمدی کانفرنسوں کے انعقاد کے ذریعے تمام دینی جماعتوں کے قائدین کو ایک پلیٹ فارم پر متحد ہونے اور سیرتِ نبویؐ سے ماخوذ کسی ایک منہاج پر متفق ہو کر اس طریق کار کے مطابق جدوجہد کا آغاز کرنے کی دعوت دی ہے۔ امیر تنظیم اسلامی کے پاس بھی ایک انقلابی پروگرام ہے جس سے معاصرین واقف ہیں۔ چنانچہ ان کانفرنسوں میں کسی نے تنظیم کے انقلابی پروگرام کی تائید کی، کسی نے اپنے رنگ میں بات کی اور کچھ نے ایسے طریقوں کی نشاندہی کی جو سوال کو اور پیچیدہ بنا گئے۔ ان حالات میں یہ سوال اور زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ملک میں دینی خطوط پر دو بڑی جماعتیں کام کر رہی ہیں ـــــ ایک جماعت اسلامی، جس نے مروجہ سیاسی راستہ یعنی انتخابات کو غلبۂ دین کے حصول کا ذریعہ بنایا ہے اور دوسری تبلیغی جماعت، جس نے دعوتِ ایمان اور اصلاحِ کلمہ و نماز کا راستہ اختیار کیا ہوا ہے۔ اقامت دین کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ جب سب لوگ ایمان و یقین والے ہو جائیں گے، سب لوگ اپنے اپنے اعمال درست کر لیں گے تو اللہ کا دین خود بخود غالب ہو جائے گا۔

جہاں تک انتخابی طریق کار کا تعلق ہے، پچاس سالہ ملکی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مختلف دینی جماعتوں کا الیکشن میں حصہ لینا عوام میں دینی بیزاری اور تفرقے کا سبب ہی بنا ہے۔ مزید یہ کہ اس میں کامیابی کے ہتھیار دھکا، دھونس، دھاندلی، دولت اور برادری ازم ہیں۔ چنانچہ اس راستہ کو اختیار کر کے ایک دین دار شخص اپنے اخلاق و کردار کو آلودگی سے کیسے بچا سکتا ہے؟ نیز اس طریق پر چل کر دین کی خدمت ہو گی یا نقصان؟ ان سوالات کا جواب انتخابی راہ اختیار کرنے والوں کے موجودہ طرزِ عمل سے مل جاتا ہے کہ فی الحال انہوں نے اس راہ سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔ دوسری بڑی جماعت کی

جدّوجہد دعوتِ ایمان اور اصلاحِ اعمال پر منحصر ہے۔ وہ اس کو نبیوں کا کام کہتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع کے مکلّف ہیں یا آپؐ سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء کے؟ اگر تمام انبیاء کی زندگیوں کا نچوڑ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں رکھ دیا گیا ہو' آپ خاتم النبیین' رحمۃً للعالمین اور رسول الی کافّۃ الناس ہوں تو کیا آپؐ نے مجرد دعوت سے اسلام کو جزیرہ نمائے عرب پر غالب کر دیا؟ جب سے یہ تحریک برپا ہے اس طرح کے سوالوں کے ساتھ جب بھی ان سے رجوع کیا گیا تو جواب یہی ملتا ہے کہ بزرگوں سے پوچھئے۔ اور بزرگوں کی خدمت میں حاضری سے پتہ چلتا ہے کہ چلہ لگائے بغیر یہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ جبکہ چلہ لگا کر فارغ ہونے والوں کی کثیر تعداد ملک کے طول و عرض میں بلکہ پوری دنیا میں ہر وقت گھوم پھر رہی ہے۔ اس کے باوجود اقامت دین کی راہ واضح نہیں ہو رہی اور اقامت دین کے لئے کوئی واضح پروگرام اس جماعت سے وابستہ لوگوں کے ذہنوں میں نظر نہیں آتا۔

جیسے عرض کیا جا چکا ہے کہ تنظیم اسلامی بھی اقامت دین کے لئے ایک پروگرام رکھتی ہے۔ چنانچہ تنظیم کے انقلابی طریق کار کے بارے میں امیر تنظیم فرماتے ہیں :

"ہمارا دعویٰ صرف یہ ہے کہ سیرت النبی ﷺ ہی اس عظیم انقلاب کے طریق کار اور لائحہ عمل کا واحد منبع اور سرچشمہ ہے۔ لہٰذا ہم اس کی جانب اس مجبوری کے تحت رجوع کر رہے ہیں کہ ؎

جز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ
ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں!

نیز ہمیں علیٰ وجہ البصیرت یہ معلوم ہے کہ جا ایں جا است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

کے مطابق سیرت النبیؐ کے راستے کے سوا سارے راستے کسی نہ کسی دوسری منزل کی جانب لے جانے والے ہیں' اللہ کے عطا کردہ نظامِ عدل و قسط کی جانب نہیں"۔

دینِ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے' اس پر جزوی عمل پیرا ہونا اللہ تعالیٰ کو قابل قبول

نہیں ہے۔ اسی طرح اس کو غالب کرنے کا طریق کار بھی اللہ کا عطا کردہ ہے' جو رسول اللہ ﷺ کی عملی جدوجہد کی شکل میں ہمیں دیا گیا۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے :

((تَرَكْتُ فِيكُمْ اَمْرَيْنِ ' لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا ' كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ رَسُوْلِهٖ))

"میں تمہارے مابین دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں' تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے' جب تک ان دو چیزوں سے چمٹے رہو' یعنی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سُنّت"۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿ هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ .... ﴾

"وہی ہے (اللہ) جس نے اپنے رسول کو بھیجا' الھدیٰ اور دین حق دے کر' تاکہ وہ اسے تمام دین (کل نظامِ زندگی) پر غالب کر دے...."

قرآن پاک میں تین مقامات پر وارد ہونے والی اس آیۂ مبارکہ میں غلبہ دین اسلام کی پیشین گوئی موجود ہے۔ وہ دین جس کے شارع کے ذمہ طہارت تک کے احکام کو بھی واضح کر دینا تھا' کیا وہ غلبۂ دین جیسے اہم کام کے لئے کوئی طریق کار نہیں دے گئے تھے' جبکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ﴾

"ہم نے تم میں سے ہر ایک (اُمت) کیلئے ایک شریعت اور منہاج مقرر کیا ہے"۔

نبی اکرم ﷺ نے نبوت سے پہلے بھی شرک نہیں کیا تھا۔ آپؐ بعثت سے پہلے بھی اعلیٰ اخلاق کا نمونہ تھے۔ گویا انسانیت کبھی بھی اخلاقی اصولوں سے ناواقف نہیں رہی۔ اسے اگر واقفیت نہیں تھی تو ان قوانین سے نہیں تھی جو اخلاقی کی حدود کا تعین کرتی ہیں۔ اگر واقفیت نہیں تھی تو اس طریق کار سے نہیں تھی جس پر چل کر قوتِ نافذہ حاصل ہو سکتی۔ نبوت سے پہلے غارِ حرا میں نبی اکرم ﷺ کا ہفتوں عشروں پر محیط غور و فکر کیا اسی مقصد کے لئے نہ تھا کہ کس طرح انسانوں کو عادلانہ قوانین کے شکنجہ میں جکڑ کر ایک اللہ کے حضور پیش کر دوں؟ بقول شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ : اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے قلب مبارک کو اصلاحِ

آدمیت کے جذبہ سے معمور پایا تو اپنی نعمت کا احسان ان الفاظ میں جتلایا :

﴿ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى ﴾

"اس نے آپؐ کو راہِ حق کی تلاش میں سرگرداں پایا تو ہدایت دے دی"۔

جس ہستی نے انسانیت کی ہدایت کے لئے آپؐ کو دین حق دیا اس نے وہ منہاج بھی عطا کیا جس پر چل کر دین حق کے غلبے کے ذریعے معاشرہ کو عدل و انصاف پر قائم رکھا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں، اس راستے کی منزلیں بھی اپنی نگرانی میں طے کروائی گئیں۔ چنانچہ اس جدوجہد کے کٹھن مراحل طے کرتے ہوئے جب آپؐ کی طبیعت میں پریشانی یا بے چینی پیدا ہوئی تو ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :

﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا .... ﴾

"(اے نبیؐ!) اپنے رب کا حکم آنے تک خود کو تھام کر رکھئے، بے شک آپ ہماری نگاہوں میں ہیں...."

چنانچہ آپؐ کی تیئس سالہ نبوی زندگی واقعات کا بے ترتیب مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک مربوط اور منظم تحریک تھی، جس کی ابتدا بھی اپنے مقصد کے اعتبار سے اتنی ہی روشن اور واضح تھی جس طرح اس کا انجام۔ کسی مرحلہ پر بھی نتائج دھندلائے نہیں۔ کسی مرحلہ پر بھی اس تحریک سے وابستہ امیدیں ختم نہیں ہوئیں۔ اپنے نتائج سے دنیا کو روشن کر دینے کا ایمان اور یقین ہر ہر قدم پر اس تحریک کے کارکنوں کا خاصہ رہا ہے، کیونکہ یہ ایک مکمل تحریک تھی اور اس تحریک کو لے کر چلنے والی ہستی مکمل ترین ہستی تھی ـــــ رسولِ کامل ـــــ دنیا کے مکمل ترین انقلاب کے رہبر۔

کائنات کے ادنیٰ سے ادنیٰ ذرے میں خالق کائنات نے وہ ترتیب اور نظم رکھا ہے کہ حکماء جب ان پر غور کرتے ہیں تو وہاں سے کلئے اور اصول اخذ کر لیتے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ رسول کامل ﷺ کی جدوجہد سے طریق کار اخذ نہ کیا جا سکتا ہو، کہ جن کا بھیجنے والا کہہ رہا ہو ﴿ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ﴾ "آپؐ ہماری نگاہوں میں ہیں"۔ گویا اس جدوجہد کا ایک ایک قدم دین حق عطا کرنے والے کی راہنمائی میں پڑ رہا ہے۔ اس حال میں آپؐ کی حیات طیبہ کے واقعات کو اتفاقی تصور کر لینا اور اس سے انقلابی جدوجہد کا کلیہ یا اصول وضع نہ کر سکنا دورِ حاضر کے انسان کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے؟

عملی اور فکری انحطاط کے اس دور میں' جو کہ ایک انقلابی جدّوجہد کا متقاضی ہے' میدانِ عمل میں نمایاں جماعتوں کے خود ساختہ طریقوں نے دین کی جدوجہد کو لوگوں کی نظروں میں بے وقعت بنا کر رکھ دیا ہے جب کہ مروجہ سیاست کا راستہ ذلت و رسوائی' دین بیزاری اور فرقہ پرستی کے علاوہ کسی چیز کو فروغ نہیں دے رہا۔ اسی طرح موجودہ صدی میں دعوت و تبلیغ کے جاری طریقے نے لوگوں کے مزاج سے دینی غیرت و حمیت کو اکھاڑ کر انہیں درویشی اور مسکنت کا ماحول دیا ہے۔ انتہائی خطرناک صورت حال یہ ہے کہ اس مزاج کو "نبیوں کے کام" کے نام پر بڑے جزم کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے' جب کہ کسی دوسرے کی بات سننے کے لئے کان بند' آنکھ بند والا معاملہ کیا ہوا ہے۔ آج اس ایمان ویقین اور دینی تربیت کی ضرورت ہے اور فرائض دینی کا وہ جامع تصور درکار ہے جس کے نتیجے میں ایسی شخصیتیں پیدا ہوں جو دین اسلام کے شایانِ شان ہوں' جو باطل کے مقابلے میں سر اٹھا کر چل سکیں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں' جو قرآن و سُنّت پر نہ صرف عمل کرنے والے ہوں بلکہ دلائل کے ساتھ باطل نظریات کا توڑ کر سکیں۔ یہ ایک خلا تھا جسے پُر کرنے کی ضرورت تھی۔

راقم الحروف نے اپنے گاؤں میں جب دین کی تعلیمات کا نچوڑ پیش کیا تو جن لوگوں کے ہاتھ میں منبر و مصلّٰی کے معاملات تھے انہوں نے یہ کہہ کر بات سننے سے انکار کر دیا کہ جس دین کی باتیں تم کرتے ہو گاؤں میں اس کی ضرورت نہیں' ہم جہاں تک عمل پیرا ہیں ہمارے لئے اتنا ہی دین کافی ہے' اس کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ دعوت و تبلیغ اور صوم و صلوٰۃ کی اصلاح کرنے والے حضرات سے جب بھی بات ہوئی ہے تو کچھ اسی طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس مزاج کی خطرناکی کو اجاگر کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ دینی تعلیمات کا نقشہ جو یہ پیش کر رہے ہیں وہ مکمل نہیں' ادھورا ہے۔ کیونکہ جو خطہ ارضی اللہ نے ہمیں دیا ہے وہاں دین کو عملاً نافذ کئے بغیر دعوت میں کوئی وزن پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔ جبکہ دین صرف اور صرف حضور ﷺ کے منہاج پر چل کر ہی نافذ ہو سکتا ہے۔ گویا منہج انقلاب نبویؐ کے بغیر ایک خطرناک خلا ہے کہ جس کو اگر بروقت پورا نہ کیا گیا تو شاید یہ منزل ہمارے ہاتھوں کبھی سر نہ ہو۔

مذکورہ بالا دونوں تحریکوں کی ابتدا تقسیم ہند سے پہلے انگریزی دور میں ہوئی۔

جماعت اسلامی نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں مسلمانوں کو اپنی شناخت سے روشناس کرایا اور مسلمانوں کو متحدہ ہندوستانی قومیت میں تحلیل ہونے سے بچایا۔ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کے لئے دلائل پر مبنی فکری مواد فراہم کیا۔ اس طرح جماعت اسلامی نے مسلم لیگ کے اس موقف کو تقویت دی جس کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا۔ جماعت اسلامی نے ہی حکومت الٰہیہ کے خدوخال سے عوام کو آگاہ کیا اور یہ کام اتنا جاندار تھا کہ دوسرے ممالک میں اسلام کے احیاء کے لئے اٹھنے والی تحریکوں کو بھی فکری اور عملی بنیادیں فراہم کرنے کا ذریعہ بنا۔ اس کے علاوہ اعلانِ آزادی کے ساتھ ہی قتل وغارت گری اور نقل مکانی کا سلسلہ شروع ہوا تو اس جماعت کے اکابرین انسانیت کی مدد کیلئے کھلے آسمان تلے خیمے لگا کر ہمہ تن اس کام میں مشغول ہو گئے۔ بقول میاں طفیل محمد :

"مولانا نے ملک بھر میں پھیلے ہوئے جماعت اسلامی کے کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ فی الفور لاہور پہنچیں۔ یہ کارکنان جیسے جیسے لاہور پہنچتے گئے' ان میں سے کچھ کو لاہور کی صفائی پر لگا دیا اور کچھ کو مہاجر کیمپوں میں مہاجرین کی دیکھ بھال کیلئے متعین کر دیا۔ دوسری طرف انہوں نے کوششیں کیں کہ اہل خیر کی مدد سے مہاجرین کی خورد و نوش کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ سینکڑوں کی تعداد میں لوگوں نے دیگیں پکا کر مہاجر کیمپوں میں بھیجنا شروع کیں"۔

(ہفت روزہ تکبیر ۲۱/ اگست ۱۹۹۷ء' جماعت اسلامی اور اسلامی دستور کی جدوجہد)

قیام پاکستان کے بعد احتجاجی سیاست کے ذریعے قرارداد مقاصد پاس کروانے کا ذریعہ بھی یہی جماعت بنی۔ قوم کو تجدید و احیائے دین کی فکر نو اور الجہاد فی الاسلام کا ولولہ دیا۔ لیکن بقول ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

"یہ جماعت راہِ یسیر یعنی شارٹ کٹ کی بھول بھلیوں میں گم اور ملکی سیاست کی دلدل میں پھنس اور دھنس کر رہ گئی"۔

دوسری طرف دعوت و تبلیغ والی جماعت کا اسلامی تشخص کو اجاگر کرنے کی کشمکش یا تقسیم ملک کے دوران انسانیت کی خدمت میں کوئی رول نظر نہیں آتا۔ وجہ صرف یہی ہے کہ برائی کے خلاف کوئی اقدام کرنے کو یہ حضرات فساد فی الارض سمجھتے ہیں اور عوام کی بہت بڑی تعداد جن کے پاس وسائل بھی ہیں اور کام کا جذبہ بھی ہے' ان کی ساری توانائیاں ملک گردی میں کھپا رہے ہیں۔ نماز' روزے اور کلمے کی اصلاح کے کام سے

انکار نہیں ہے' لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی تو دینی فریضہ ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل ہدف دین کے نظامِ عدل و قسط کا قیام ہے۔ کلمے کا وِرد' نماز' روزہ تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے مجاہدین کے اوصاف اور روزانہ کے معمولات ہیں۔ چنانچہ ان حالات میں اس کام کی اہمیت کا درجہ صرف اتنا ہی ہے جیسے ہم اپنے خاندان کے بچوں کو بنیادی دینی باتیں سکھانے کا کام کریں۔ گویا یہ لوگ قوم کو کلمہ اور نماز روزہ سکھانے کا کام کر رہے ہیں لیکن اس کام سے کسی انقلابی تبدیلی کا ہدف پورا ہونے کی توقع رکھنا غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں۔

یہ وہ حالات ہیں جن کی وجہ سے عوام الناس میں اسلامی انقلاب کے بارے میں مایوسی کی کیفیت پیدا ہوئی ہے اور اسلامی انقلاب کو ناممکن الوقوع معاملہ سمجھا جا رہا ہے۔ نیز امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہم ذمہ داری سے گریز کی وجہ سے لاالٰہ الا اللہ کی بنیاد پر وجود میں آنے والے ملک میں معاشرے کی حالت یہ ہے کہ اقامت دین کے دعوے دار' دعوت و تبلیغ والے' مجاہدین اسلام' سنتوں کا احیاء کرنے والے' سود خور' سرمایہ دار اور جاگیردار' حکومت کے راشی اور حرام خور کارندے' نظامِ باطل کے محافظ اور ظالمانہ نظام میں پسنے والے عوام ـــــ یہ تمام طبقات امن سے ایک ملک میں رہ رہے ہیں۔ یعنی اہل اللہ اور غلط کاروں کے درمیان کوئی نمایاں چپقلش معاشرے میں نظر نہیں آتی۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے ڈاکٹر اسرار احمد کو توفیق بخشی کہ انہوں نے نہ صرف نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے غلبۂ دین حق کے طریق کار کا اصول اور فارمولا اخذ کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیا بلکہ پچیس برس قبل ایک اسلامی انقلابی جماعت "تنظیم اسلامی" قائم کر کے سیرتِ نبویؐ سے ماخوذ منہج انقلابِ نبویؐ کے مطابق جدوجہد کا آغاز بھی کر دیا۔ انقلابِ نبویؐ کا منہاج مختصراً پیش خدمت ہے :

۱) دعوت و تبلیغ کے ذریعے انسانوں کی افرادی قوت کی فراہمی

۲) ایک امیر کے ہاتھ پر بیعت کے مسنون طریقے پر منظم کر کے اجتماعی طاقت اور بنیانِ مرصوص بنانا۔

۳) تعلیم و تزکیہ کے ذریعے ان میں مطلوبہ اوصاف اور صلاحیت پیدا کرنا۔

۴) صبر محض (جس طرح مکی زندگی میں ایذائیں برداشت کرتے ہوئے دعوت کو جاری رکھا گیا اور کوئی جوابی کارروائی نہیں کی گئی)۔

۵) اقدام (جس طرح ہجرت کے بعد قریش مکہ کی دُکھتی رَگ یعنی تجارتی راستوں پر دستے بھیج کر ان راستوں پر ان کی آمدورفت کو مخدوش بنایا گیا)۔

۶) مسلح تصادم (جیسے جنگ بدر، اُحد، احزاب، فتح مکہ اور پھر پورے عرب پر غلبہ دین)

مسلح تصادم چونکا دینے والی اصطلاح ہے، لیکن ہمیں جان لینا چاہئے کہ دورِ نبویؐ اور موجودہ حالات میں تمدنی ارتقاء کے باعث درج ذیل اعتبارات سے فرق واقع ہو چکے ہیں:

۱) نبی کریم ﷺ کی جدوجہد ایک خالص مشرکانہ اور کافرانہ معاشرے میں تھی، جبکہ ہماری جدوجہد مسلمانوں میں ہے۔ انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ کے تمام اراکین اسلام کے دعوے دار ہیں۔

۲) آنحضور ﷺ کے زمانے میں عرب میں کوئی منظم حکومت قائم نہیں تھی اور مسلح تصادم کے آغاز کے وقت بھی اسلام اور کفر کی طاقت میں نسبت و تناسب (تعداد اور اسلحہ کے لحاظ سے) ایک اور دس سے زیادہ کا نہیں تھا۔ جبکہ آج باقاعدہ پولیٹیکو، سوشیو، اکنامک سسٹم قائم ہیں۔ ان کی پشت پر بے پناہ قوتوں سے مسلح مقامی حکومتیں ہی نہیں عظیم عالمی قوتیں بھی ہیں جن کے ساتھ عوام کے مسلح تصادم کا معاملہ تقریباً محال کے درجہ میں آچکا ہے۔

۳) ریاست اور حکومت دو علیحدہ علیحدہ چیزیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ ریاست ایک بالکل علیحدہ شے ہے اور حکومت صرف ریاست کے معاملات چلانے والا ایک انتظامی ادارہ ہے۔ حکومت آج کسی کی ہے تو کل کسی اور پارٹی کی ہو سکتی ہے، یہ آنی جانی شے ہے، مستقل حیثیت صرف ریاست کو حاصل ہے۔

۴) پوری دنیا میں یہ بات مسلّم سمجھی جاتی ہے کہ کسی حکومت کو بدلنے کا حق اس ملک کے رہنے والوں کو حاصل ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ سیاسی جماعتیں بنا سکتے ہیں اور ہر پارٹی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ موجودالوقت حکومت کو ہٹانے کی مہم چلائے، اس پر

دل کھول کر تلخ و تند تنقیدیں کرے اور رائے عامہ کو اپنی پارٹی کے حق میں ہموار کرے' تاکہ اس پارٹی کی حکومت قائم ہو سکے۔ اس طرح کسی بھی ملک کے باشندوں کو آئینی طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ حکومت کو بدل دیں۔

موجودہ دور میں ان پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی جماعت پہلے مذکورہ بالا چار مراحل دعوت' تنظیم' تربیت اور صبر محض پر عمل پیرا ہو اور رائج الوقت نظام اور اس کو چلانے والے انتظامی ادارے یعنی حکومت کے مقابلے میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کیلئے کمر کس لے۔ پھر جان ہتھیلی پر رکھ کھڑی ہو جائے اور صرف زبانی کلامی بات کرنے کی بجائے علی الاعلان یہ کہے کہ اب فلاں فلاں منکر کام ہم ہرگز نہیں ہونے دیں گے اور اب یہ کام ہماری لاشوں پر ہو گا۔ پھر اس پر ڈٹ جائے' اور ہر نوع کی مالی اور جانی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہ کرے۔ البتہ یہ احتیاط سختی سے کی جائے کہ اپنی طرف سے ہاتھ نہ اٹھایا جائے' کسی قسم کی توڑ پھوڑ نہ ہو' جماعت میں ایسا ڈسپلن ہو کہ ہر نوع کی بدامنی کو قابو میں رکھ سکے' یعنی حکومت گرفتار کرے تو مظاہرین مزاحمت نہ کریں۔ لاٹھی چارج کرے تو اسے جھیلیں' آنسو گیس کے شیل برسائے تو برداشت کریں۔ حتیٰ کہ گولیاں برسائے تو اپنے سینے پیش کریں' لیکن پیچھے نہ ہٹیں اور نہ اپنے موقف کو چھوڑ دیں۔ یہ جدوجہد اپنے مقصد کے حصول تک جاری رہے۔ ایسی تحریک یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب ہو گی۔ لیکن پہلے چار مراحل پر عمل پیرا ہونا اس جماعت کا اصل سرمایہ ہو گا۔

جب یہ لوگ نظامِ باطل کے راستے کی رکاوٹ بنیں گے تو حکومت کی طرف سے تعذیب خاموش اکثریت کو ان کی پشت پر کھڑا کرا دے گی اور تعذیب کا سلسلہ زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکے گا۔ اس لئے کہ ڈنڈے برسانے والی حکومتی مشینری اندھی' بہری نہیں ہے۔ پھر یہ لوگ ان سرکاری اہلکاروں کے چچا' تایا' بھانجے اور بھتیجے ہوں گے' اس لیے وہ کب تک گولی اور ڈنڈے سے کام لیں گے۔ پھر جب یہ لوگ دیکھیں گے کہ اس تحریک کا مطالبہ شر پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ تو خود قومی اور انسانی بھلائی کے طالب ہیں' عادلانہ نظام چاہتے ہیں' معاشرے کو بے حیائی اور بے شرمی سے پاک کرنا چاہتے ہیں تو یقیناً یہی لاٹھی اور گولی چلانے والے لوگ بالآخر ہاتھ کھڑے کر دیں گے اور انتظامیہ کو

مجبور کر دیں گے کہ ہمارے ان بھائیوں کے مطالبے سنو اور مانو۔ یہی وہ وقت ہو گا کہ ہم نظامِ باطل کو بتدریج اسلام کے نظامِ عدل و قسط میں بدلنے کی پوزیشن میں ہونگے۔ ان سارے مراحل سے گزرتے ہوئے جان جاتی ہے تو "ھو المطلوب" اور اگر کامیابی ہوتی ہے تو دوہری خوشی اور دوہرا اجر۔

بات مکمل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ تنظیم اسلامی کی جانب سے کی گئی آج تک کی مساعی کا تعارف کرا دیا جائے۔ ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے کارکنوں کو ایک مربوط نظام میں جوڑا گیا ہے۔ مختلف شہروں میں ذیلی مراکز اور دفاتر قائم کئے گئے ہیں جہاں سے نشر و اشاعت کا کام جاری ہے۔ ماہانہ' پندرہ روزہ' ہفت روزہ دروسِ قرآن اور رمضان المبارک میں دورانِ تراویح دورہ ہائے ترجمہ قرآن کا بندوبست انہی مراکز کے ذریعے ہوتا ہے۔ عربی زبان سیکھنے اور قرآن پاک کی فکری و عملی راہنمائی کیلئے قرآن پاک کے منتخب حصوں پر مشتمل دروس سے بذریعہ ڈاک استفادے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے ذیلی مراکز میں بھی وقتاً فوقتاً کلاسز اور کورسز منعقد کئے جاتے ہیں۔ علومِ قرآنیہ کی اشاعت' باطل نظریات پر کڑی نظر اور ان کا رد' حالاتِ حاضرہ پر نظر اور برائیوں اور خرابیوں کی مذمت کیلئے ہفت روزہ ندائے خلافت' ماہنامہ میثاق اور حکمت قرآن اور انگریزی زبان میں سہ ماہی قرآنک ہورائزنز شائع کئے جاتے ہیں۔

ذیلی مراکز کے تحت دو روزہ' سہ روزہ' ہفت روزہ دعوتی پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں جن میں رفقائے کار گلی گلی' شہر شہر دینِ متین کی دعوت لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کارنر میٹنگز اور تفہیم دین کورس منعقد کئے جاتے ہیں تاکہ عوام الناس کی ذہنی تربیت کا مقصد حاصل ہو۔ ذیلی مراکز اور بالخصوص مرکزی سطح پر وقت کی ضرورت کے مطابق قومی معاملات پر سیمینار منعقد کروائے جاتے ہیں۔ متحدہ اسلامی انقلابی محاذ کی تشکیل کے لئے حالیہ جدوجہد کے علاوہ تنظیم اسلامی نے پہلے بھی متعدد بار جماعتوں کے اتحاد کی کوششیں کی ہیں جن کا ریکارڈ محفوظ ہے۔ فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ادائیگی کے طور پر موجود الوقت نظام کی خرابیوں پر تنقید اور کھل کر مذمت کی جاتی ہے۔ اس کے لئے موقع کی مناسبت سے پُرامن مظاہرے ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے "تکمیل دستورِ اسلامی" کے عنوان سے دستورِ پاکستان میں نفاذِ اسلام کی راہ میں

موجود رکاوٹیں دور کرنے کے لئے کچھ دستوری ترامیم تجویز کی گئیں جس کے لئے ملکی سطح پر پوسٹ کارڈ مہم چلائی گئی اور اعلیٰ ترین حکومتی شخصیتوں سے مل کر انہیں اسلامی دستور کے نفاذ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی۔

تنظیم اسلامی کے کارکنوں کے لئے قرآن و سنّت پر عمل اور ان کی تربیت کیلئے ترغیب و تشویق اور اس پر محاسبہ کا داخلی نظام بھی موجود ہے' جس کے تحت ہر کارکن کی دینی کیفیت اور اخلاق و کردار پر نظر رکھی جاتی ہے اور ان کی راہنمائی کی جاتی ہے۔ دین کے جامع فرائض کو سمجھنے کیلئے مرکزی سطح پر مسلسل ہفت روزہ تربیت گاہیں منعقد کی جاتی ہیں جن میں رفقائے تنظیم شرکت کرتے ہیں۔ اقامت دین کی جدوجہد میں شرکت کرنے والے ہر رفیق کو کم از کم ایسی دو تربیت گاہوں میں شامل ہونا لازمی ہوتا ہے۔

دعوت' تنظیم اور تربیت کے ان مراحل کے نتیجہ میں جونہی ایک خاص تعداد تربیت یافتہ کارکنوں کی میسر آگئی تو اس سے اگلا مرحلہ اقدام یعنی نظامِ باطل کی دکھتی رگ کو چھیڑنے کے لئے پُرامن مزاحمتی اور عدم تعاون کی تحریک شروع کی جائے تاکہ حکومت وقت کو دین اسلام کے مطابق نظام چلانے پر مجبور کیا جاسکے۔ اس وقت تک نظام باطل کی خرابیوں اور برائیوں کو ابلاغ کی تمام سطحوں پر اجاگر کرنے اور نظام اسلامی کی برکات سے عوام کو آگاہ کرنے کا کام جاری رہے گا۔

اس کے علاوہ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے' جن کو اللہ نے وقت کی نبض دیکھنے کی صلاحیت بھی عطا کی ہے' پاکستان کے موجودہ حالات کے پیش نظر یہ تجویز کیا ہے کہ تمام دینی جماعتیں اقتدار کی کشمکش اور انتخابی سیاست سے علیحدہ ہو کر ایک متحدہ اسلامی انقلابی محاذ قائم کریں' جس کا واحد ایجنڈا ملک میں اسلامی نظام کا قیام ہو اور یہ اتحاد سیرت النبیؐ سے ماخوذ کسی ایک منہاج پر متفق ہو کر اس طریقہ کار کے مطابق جدوجہد کا آغاز کرسکے۔ اس ضمن میں تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام اب تک ملک بھر میں منعقد ہونے والی کانفرنسیں اگرچہ دینی جماعتوں کے قائدین کی بھرپور شمولیت اور شرکاء کی تعداد کے اعتبار سے کامیاب رہی ہیں اور سب جماعتوں نے ایسے اتحاد کی تشکیل کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا ہے تاہم اس جدوجہد کے لئے سیرت النبیؐ سے ماخوذ کسی متفقہ انقلابی منہاج کی طرف تاحال کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی ہے۔ چنانچہ ہماری دینی جماعتوں

کے قائدین اور ارکان سے گذارش ہے کہ وہ اوپر بیان کیے گئے اسلامی انقلاب کے نبوی طریق کار پر مزید غور و فکر کر کے وقت کی اِس پکار پر لبیک کہیں اور کسی متفقہ طریق کار کی تشکیل میں ہرگز دیر نہ کریں، کیونکہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کل ہمیں اس کام کے لئے مہلت بھی ملتی ہے یا نہیں ؎

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی!
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!!

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS NTN BEARINGS

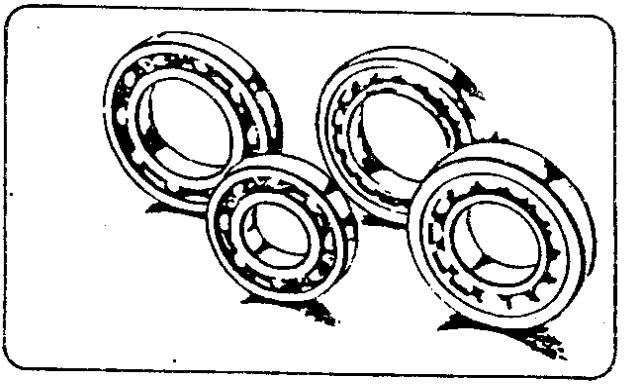

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65, Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169

GUJRANWALA : 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210807

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

فتنۂ ارتداد کی سرکوبی میں
محسنِ اُمّت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ
کا تاریخی کردار

(مرتب : حافظ محبوب احمد خان)

اقوام کی تاریخ میں انبیاء علیہم السلام کی حیثیت ہمیشہ گل سرسبد کی رہی ہے۔ انسانیت کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاءؑ کو بھیجا جنہوں نے انسانوں کو گمراہی و ضلالت سے نکال کر راہ ہدایت پر لگایا۔ مذاہب کی تاریخ میں ایک سنگ میل اس وقت آتا ہے جب نبیؐ کی وفات ہوتی ہے۔ اس موقع پر یا تو قوم منتشر ہو جاتی ہے یا پھر انبیاءؑ کی تعلیمات کو بھلا کر شرک و گمراہی کی راہ پر چل پڑتی ہے۔ دوسری صورت میں اگر نبیؐ کا کوئی پیروکار اپنی ایمانی قوت کے ساتھ اس موقع پر اپنی قوم کی رہنمائی کرے تو یہ قوم صدیوں تک شان و شوکت کے ساتھ دنیا میں زندہ رہتی ہے۔ بیشتر انبیاءؑ کو ایسے جانشین میسر نہیں آئے جو ان کے بعد ان کی اُمت کو راہِ ہدایت پر لاتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انبیاء میں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ان کی اُمت ان کی زندگی میں گمراہ ہوئی اور اسی گمراہی کے دَور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوئی، مگر یہ فضیلت بھی انہی کو حاصل ہے کہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے مدتوں تک دنیوی نعمتوں اور بادشاہت و اقتدار سے نوازا۔

اُمت مسلمہ کو اس حیثیت سے خاص اہمیت حاصل ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسی جلیل القدر پُرعزم شخصیت اُمتِ مسلمہ کو ملی جس نے اپنی عظمت و ہمت سے اپنے نبی ﷺ کی نیابت کا حق ادا کیا اور آپ کا باحوصلہ اور جرأت مندانہ کردار اُمت مسلمہ کے لئے ایک نئی زندگی ثابت ہوا۔ تاریخ میں ایسا دورِ امتحان بھی کسی اُمت پر نہیں آیا جیسا کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد اُمت مسلمہ کو درپیش ہوا (کہ قریش و قبیلہ ثقیف کے علاوہ تمام عرب نے ارتداد اختیار کر لیا) اور تاریخ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا بے مثال کردار بھی پیش کرنے سے عاجز ہے۔ موجودہ دور میں بھی اُمت مسلمہ ایسے ہی مسائل سے دوچار ہے، ایک جانب قادیانی ہیں تو دوسری جانب

لاہوری گروپ۔ ہم آج بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعلیمات اور کردار سے رہنمائی حاصل کر کے اسلام کو درپیش فتنۂ ارتداد کا خاتمہ اور قلع قمع کر سکتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ نے مرتدین کو ذرہ بھر رعایت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ مرتدین کی جانب سے اپنے قاصدین کے ذریعے یہ پیغام بھیجا گیا کہ ہم صرف نماز پڑھیں گے اور زکوۃ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر ان کی طرف ایک عقال (وہ رسی جو اونٹ اور گھوڑے کے پاؤں میں باندھی جاتی ہے) بھی نکلے تو اس کو حاصل کرنے کے لئے بھی میں ان سے جنگ کروں گا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتدین کی سرکوبی کے لئے گیارہ لشکر ترتیب دیئے۔

۱) حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو طلیحہ بن خویلد اور اس کی سرکوبی کے بعد بطاح میں مالک بن نویرہ کی جانب ۲) عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابی جہل کو مسیلمہ کذاب کے مقابلے میں ۳) مہاجر بن ابی امیہ رضی اللہ عنہ کو اسود عنسی کی جانب اور اس کے بعد انبار (جہاں قیس بن مکشوح اور اہل یمن نے ارتداد اختیار کیا تھا) کی اسلامی فوج کی اعانت' اور یہاں سے فراغت کے بعد کندہ میں حضرموت کی جانب ۴) خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو حمقتین شام کے ابتدائی حصہ پر ۵) عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو قضاعہ' ودلیعہ اور حارث ۶) حذیفہ بن محصن رضی اللہ عنہ کو اہل دبا ۷) عرفجہ بن ہرثمہ رضی اللہ عنہ کو مہرہ کی جانب ۸) شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابی جہل کی امداد کو بھیجا اور یمامہ کی مہم سے فراغت کے بعد قضاعہ کے مرتدین کی جانب ۹) طریفہ بن حاجز رضی اللہ عنہ کو بنی سُلیم اور ہوازن ۱۰) سوید بن مقرن رضی اللہ عنہ کو بتالۂ یمن ۱۱) علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کو بحرین' بصرہ اور عمان کے مابین ساحل سمندر پر واقع شہروں' جہاں مرتدین محصور ہو گئے تھے' کی جانب بھیجا گیا۔ (زاد المعاد صفحہ ۷۶ جلد دوم)

اس موقع پر جو خط حضرت ابوبکر صدیق نے مرتدین کے نام لکھا اس کو ابن جریر طبری نے اپنی کتاب تاریخ طبری (جلد سوم) میں اس طرح بیان کیا ہے :

مرتدین کے نام حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا فرمان

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملک کے عام و خاص افراد کے نام خواہ وہ مسلمان ہوں یا مرتد ہو گئے ہوں۔

سلام اس شخص پر جو ہدایت اسلام کی پیروی کرے اور اسلام قبول کرنے کے بعد گمراہی و ضلالت کی طرف نہ جائے۔ پہلے میں اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں' وہ اکیلا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں' اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ حضور جو شریعت لائے ہم اس کو مانتے ہیں اور اسلام کے سوا کل مذاہب کو تسلیم نہیں کرتے اور جو اسلام قبول کرنے سے انکار کرے اس سے جہاد کرتے ہیں۔

امابعد۔ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو دین حق کے ساتھ اپنی کل مخلوقات کی طرف بھیجا

﴿ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا .... لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾

"(مسلمانوں کو جنت کی) بشارت سنانے والا اور (کافروں کو عذاب خدا سے) ڈرانے والا اور اللہ کی طرف بلانے والا اور چمکتا چراغ بنا کر بھیجا..... تاکہ محمد ﷺ زندوں کو عذاب خدا سے ڈرائیں اور کافروں پر اتمام حجت ہو جائے (کہ دنیا میں ان کو متنبہ کرنے والا آیا تھا)"۔

جس نے اسلام قبول کیا اللہ نے اس کو ہدایت دی' اور جس نے اسلام سے منہ پھیرا رسول اللہ ﷺ نے اس کو مارا حتیٰ کہ چاروں طرف طوعاً و کرہاً اسلام ہی اسلام پھیل گیا۔ حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں احکام اسلام کو نافذ کر دیا' اپنی امت کو نصیحت کی اور جو کام آپ کے ذمہ تھا پورا کر کے چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو اپنی کتاب قرآن مجید میں کھول کر بیان کر دیا۔ فرمایا :

﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾

"(اے نبی!) تم بھی مرنے والے ہو اور یہ بھی مرنے والے ہیں"۔

دوسری جگہ فرمایا :

﴿ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَاِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴾

"(اے نبی!) تم سے پہلے ہم نے کسی بشر کو یہاں ہمیشہ نہیں رہنے دیا۔ اگر تمہیں موت آجائے تو کیا یہ ہمیشہ دنیا میں زندہ رہیں گے؟"۔

صالح مسلمانوں سے خطاب کیا :

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ' قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ' اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ ' وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ' وَّسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴾

"محمد (ﷺ) صرف اللہ کے رسول ہیں' ان سے پہلے کئی رسول گزر چکے ہیں۔ پھر اگر وہ فوت ہو جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم (اے مسلمانو!) الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو شخص الٹے پاؤں پھرے گا (اسلام چھوڑ دے گا) وہ اللہ کو کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتا' اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو بدلہ دے گا"۔

جو شخص محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ فوت ہو گئے ہیں' اور جو شخص اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کرتا تھا بیشک وہ (اللہ) زندہ ہے۔

﴿ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ﴾ "اس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند"۔

وہ اپنے کام کا نگہبان' اپنے دشمن سے انتقام لینے والا ہے۔ میں تم کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ اپنا حصہ اور نصیب اللہ سے لو اور جو شریعت محمد ﷺ لائے اس کو مضبوط پکڑو۔ اس کی ہدایت پر چلو' اللہ کا دین مضبوط پکڑو' اس لئے کہ جس شخص کو اللہ ہدایت نہ دے وہ گمراہ ہوتا ہے اور جسے اللہ اپنے عذاب سے نہ بچائے وہ بلاؤں میں پھنستا ہے۔ جس کی اللہ مدد نہ کرے وہ کامیاب نہیں ہوتا۔ پس جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہوتا ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے وہی گمراہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

﴿ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴾

"جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے اللہ گمراہ کرے تو تم اس کا کوئی دوست نہ پاؤ گے جو اسے راستہ بتائے"۔

دنیا میں ایسے گمراہ (کافر) سے کوئی عمل قبول نہیں ہوتا اور نہ آخرت میں اس سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا۔ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تم سے بعض افراد نے اسلام چھوڑ دیا ہے۔ پہلے وہ مسلمان تھا اب مرتد ہو گیا ہے۔ اس نے اللہ سے دھوکہ کیا اور اپنے نفس کی جہالت کا اظہار اور شیطان کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ' كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ' اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِىْ وَهُمْ

لَكُمْ عَدُوٌّ ۚ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ ﴾

"اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم (علیہ السلام) کے آگے سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سبھی نے سجدہ کیا۔ یہ ابلیس چونکہ جنات کی قسم میں سے تھا سو اپنے پروردگار کے حکم سے نکل بھاگا۔ تو لوگو کیا ہم کو چھوڑ کر ابلیس کو اور اس کی نسل کو اپنا دوست بناتے ہو' حالانکہ وہ تمہارے قدیمی دشمن ہیں۔ ظالموں (نے جو اللہ کے بدلے شیطان کو اختیار کیا ہے ان) کے حق میں یہ بدلہ بہت ہی بُرا ہے"۔

دوسری جگہ فرمایا :

﴿ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ ﴾

"کچھ شک نہیں کہ شیطان تمہارا جانی دشمن ہے' پس تم بھی اس کو اپنا دشمن ہی سمجھتے رہو۔ وہ تو اپنے لوگوں کو اپنی طرف صرف اس غرض سے بلاتا ہے کہ وہ لوگ آخر کار دوزخیوں میں شامل ہو جائیں"۔

میں فلاں افسر کے ماتحت تمہاری طرف فوج بھیج رہا ہوں۔ میں نے اس کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ لڑائی سے پہلے تم کو اسلام کی طرف بلائے' جو شخص از سر نو اسلام قبول کرے اس کو چھوڑ دے اور اس کی اعانت کرے اور جو شخص بدستور اپنے ارتداد پر قائم رہے اس کو قتل کر دے اور ان کی بستیوں کو نذرِ آتش کر دے' ان کا قتل عام کرے' ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کر لے۔ صرف اسلام ہی ان سے قبول کیا جائے گا' دوسری کوئی بات قبول نہ کی جائے گی۔ جو شخص سر تسلیم خم کر دے گا اس کے حق میں بہتر ہو گا اور جو شخص اپنا ارتداد نہ چھوڑے وہ اللہ کا کچھ نقصان نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے قاصد کو یہ بھی حکم دیا ہے کہ وہ میرا یہ فرمان عام مجمع میں کھڑا ہو کر سنائے۔ اس کا جواب اذان ہو گا۔ اگر وہ اذان دیں تو ان کو چھوڑ دیا جائے اور اگر وہ اذان نہ دیں تو پھر میری فوجوں کو کھلی اجازت ہے کہ وہ دفعتاً ان پر حملہ کر دیں اور ان کا قتل عام کریں"۔

یہ فرمان لے کر سرکاری قاصد فوج سے آگے روانہ ہوئے اور ہر افسر کو علیحدہ علیحدہ فرمان بھی دیا گیا جس میں مرتدین کو دوبارہ اسلام کی دعوت پیش کرنے کا حکم دیا گیا

اور قبول نہ کرنے کی صورت میں ان کو قتل کرنے اور آگ میں جلا ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسلام قبول کرنے کی صورت میں ان سے احتیاط سے رہنے کا حکم دیا گیا تاکہ اگر انہوں نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تو مسلمانوں کو باہم میل جول میں نقصان نہ پہنچا سکیں۔ افسران کے لئے اپنے سپاہیوں کے ساتھ میانہ روی' خوش اخلاقی اور نرمی اختیار کرنے کا حکم دیا۔ اس فرمان میں درج تھا :

مرتدین کو قتلِ عام یا نذرِ آتش کرنے کا حکم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خلیفۂ رسول ﷺ کی طرف سے فلاں فوج کے افسر کے نام جس کو میں فلاں قبیلہ کی سرکوبی کے لئے بھیج رہا ہوں' جو اسلام سے مرتد ہو گئے ہیں اور انہوں نے کھلی بغاوت کا اعلان کیا ہے۔

تم ہر امر میں حتی الوسع اللہ سے ڈرو' اللہ کے احکام نافذ کرنے میں پوری سرگرمی سے کام لو۔ جو لوگ اسلام سے مرتد ہو گئے ہیں ان سے خوب جہاد کرو۔ پہلے ان کو سمجھاؤ اور اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ قبول کر لیں تو فبہا' اپنا ہاتھ روک لو اور جنگ بند کر دو اور اگر وہ ارتداد پر اصرار کریں اور از سرِ نو اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیں تو دفعتاً ان پر ٹوٹ پڑو اور ان پر غارت ڈالو۔ اتنا تنگ کرو کہ وہ بالآخر ہتھیار ڈالنے پر راضی ہو جائیں۔ پھر ان کو بتاؤ کہ اسلام ان سے کیا چاہتا ہے۔ ان سے باقاعدہ زکوٰۃ وصول کرو۔ دشمنانِ اسلام پر حملہ کرنے سے اسلامی فوج کو مت ہٹاؤ۔ جو شخص ہتھیار ڈال دے اور اسلام قبول کر لے اس سے ہاتھ روک لو اور اس پر حملہ نہ کرو بلکہ اس کی اعانت کرو۔ لیکن جو شخص کفر پھیلانے پر اصرار کرے اور علانیہ اسلام کی بیخ کنی کرے اس کو ضرور قتل کرو۔ مگر جو شخص ہتھیار ڈال دے پھر اس پر حملہ کرنا جائز نہیں۔ اب اللہ اس سے حساب لے گا کہ وہ دل سے مسلمان ہوا ہے یا نہیں۔ جو شخص دعوتِ اسلام قبول کرنے سے انکار کرے اس کو ضرور قتل کرو' جہاں بھی ملے اس کو نہ چھوڑو اور سوائے اسلام کے اس کی کوئی بات نہ سنو اور نہ مانو۔ اس کو اسلحہ سے قتل کرو اور آگ میں اس کو جلا دو۔ جو مالِ غنیمت حاصل ہو اس کا خمس (پانچواں حصہ) نکال کر باقی کل وہیں فوج میں تقسیم کر دو' وہ

خمس ہم کو پہنچادو۔ اپنے ہر سپاہی کو سختی سے منع کردو کہ وہ جلدی نہ کریں اور فساد کا نام نہ لیں۔ اور سنو! ہتھیار ڈالنے والوں میں بے فکری سے نہ ملو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ جاسوس ہوں اور دھوکہ سے مسلمانوں پر حملہ کر دیں' ان کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر لو۔ اسلامی سپاہیوں سے میانہ روی اختیار کرو' خوش اخلاقی سے پیش آؤ اور نرمی سے بات کرو۔ راستہ طے کرتے وقت تیز رفتار نہ ہونا تاکہ کوئی سپاہی پیچھے نہ رہ جائے"۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتدین کے متعلق جو ہدایات اپنے کمانڈروں کو دی تھیں اسی کے مطابق خود بھی مرتدین سے یہی سلوک کیا۔ فجاءۃ بن عبد یالیل حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا مجھے اسلحہ دیجئے میں مرتدین سے جہاد کروں گا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس کا مدعا پورا کیا۔ یہ روانہ ہوا' آگے جا کر مرتد ہو گیا اور نجبہ بن ابی المیثاء کو مسلمانوں پر شب خون مارنے کا حکم دیا۔ اس نے سُلیم' عامر' ہوازن کے مسلمانوں پر شدید حملے کئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو آپ نے طریفہ بن حاجز رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اللہ کا دشمن فجاءۃ میرے پاس آیا تھا اور مجھ سے کہا کہ وہ مسلمان ہے اور اسلحہ دیجئے کہ وہ مرتدین سے جہاد کرے۔ مجھے معتمد علیہ ذریعہ سے یقین کے ساتھ خبر ملی ہے کہ اس نے یہاں سے جا کر فتنہ برپا کر رکھا ہے اور مسلمانوں کو ایذاء پہنچا رہا ہے۔ تم مسلمانوں کو ساتھ لے جا کر اس پر حملہ کرو' اس کو قتل کر دو یا اس کو گرفتار کر کے میرے سامنے لاؤ۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن قیس جاسی کو حضرت طریفہ رضی اللہ عنہ کی امداد کے لئے بھیجا۔ یہ دونوں اس کی طرف روانہ ہوئے اور اس سے کتراتے ہوئے منزل طے کر رہے تھے' حتیٰ کہ مقام جواء میں تصادم ہوا' نجبہ مارا گیا اور فجاءۃ بھاگ گیا۔ طریفہ نے اس کا تعاقب کیا اور زندہ گرفتار کر لیا۔ جب فجاءۃ نے مسلمانوں کی سرگرمی دیکھی تو حضرت طریفہ رضی اللہ عنہ سے کہا تم مجھ سے زیادہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے تابعدار نہیں' تم ان کے امیر ہو' میں بھی ان کی طرف سے امیر مقرر ہوں۔ حضرت طریفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تو سچا ہے تو ہتھیار ڈال دے اور میرے ساتھ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس چل۔ اُس نے ہتھیار ڈال دیئے اور حضرت طریفہ رضی اللہ عنہ نے اس کو گرفتار کر لیا۔ جب یہ دونوں مدینہ پہنچے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ بقیع میں عید گاہ کے پاس آگ روشن کرو اور فجاءۃ کو اس میں زندہ جلا دو۔ حسب الحکم فجاءۃ کو آگ میں جھونک دیا

گیا۔ (تاریخ طبری، ج ۳، ص ۲۳۲-۲۳۵)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ایک ہدایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مرتدین کو اسلام میں واپس لوٹنے کے بعد جہاد میں شامل نہ کرنے کا حکم دیا مگر فرمایا کہ ان کو دوسرے معاشرتی اُمور میں شریک کرو۔

موجودہ فتنۂ ارتداد اور اسلام کے عالمی غلبہ میں ایک بڑی رکاوٹ سے نمٹنے کے لئے ہمارے لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل بہترین راہِ عمل ہے۔ اُمت مسلمہ جس طرح دورِ صدیقیؓ میں آزمائش سے گزر کر دُنیا کی راہبر بنی کیا خبر کہ ایک بار پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعلیمات پر عمل ہی غلبۂ اسلام کی نوید ہو؟

خلافت کی اصل حقیقت اور اس کا تاریخی پس منظر
اور عہد حاضر میں اس کے دستوری و قانونی اور معاشی و معاشرتی ڈھانچے اور اس کے
قیام کے لئے سیرت نبویؐ سے ماخوذ طریق کار کی تشریح پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد

داعی تحریک خلافت پاکستان
کے چار جامع خطبات کا مجموعہ، بعنوان :

خطبات خلافت

شائع کردہ : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

نبی اکرم ﷺ بحیثیت مدبّر و منتظم

بیگم صغریٰ خاکوانی، ملتان

سیرۃ النبی ﷺ کے کسی بھی پہلو پر لکھنے کے لئے میرے جیسی بے علم و عمل انسان کا قلم اُٹھانا یقیناً بہت بڑی جسارت ہے۔ بے بضاعتی کے شدید احساس کے ساتھ میں حیاتِ طیبہ پر کچھ تحریر کرنے سے دنوں لرزیدہ رہی کہ وہ ایسی ادب گاہِ عظیم ہے جہاں قلم و ذہن کی ذرا سی لغزش انسان کو قعرِ مذلت میں پہنچانے کو کافی ہوتی ہے۔ اس بارگاہ میں اپنی رائے کے اظہار میں کس قدر حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں بصد احتیاط و احترام اور بہ ہزار عجز و انکسار حیاتِ مبارکہ کے محض دو پہلوؤں پر اپنی بساط و بضاعت کے مطابق روشنی ڈالوں گی، یعنی حضور ﷺ بحیثیت مدبر و منتظم کے۔

جناب رسالت مآب ﷺ نے مکّہ میں جو انفرادی اور ازدواجی زندگی گزاری وہ انتہائی پُرکشش اور مثالی تھی۔ آپؐ اپنی شرافت و دیانت، صداقت و متانت، فہم و فراست اور حسن اخلاق جیسی خوبیوں کی بدولت نہ صرف اپنے قبیلے والوں کے دلوں میں مقام و احترام حاصل کر چکے تھے، بلکہ پورے شہر مکہ میں آپؐ صادق و امین کے لقب سے پہچانے جاتے تھے۔ اس بات کے ثبوت میں نبوت سے ۵ برس قبل کا ایک واقعہ پیش خدمت ہے، جس سے نہ صرف نبی کریم ﷺ کی ذہانت و دانش مندی ظاہر ہوتی ہے بلکہ مکّہ والوں کا آپؐ پر حد درجہ اعتبار و اعتماد بھی واضح ہوتا ہے۔ ہوا یہ کہ شدید بارشوں کی وجہ سے کعبۃ اللہ کی دیواریں منہدم ہو گئیں۔ تعمیرِ نو کے موقعہ پر معززینِ قریش کا ہر فرد شدت سے متمنی تھا کہ حجرِ اسود کی تنصیب کی سعادت اس کے حصے میں آئے۔ جھگڑا جب حد سے بڑھا اور قریب تھا کہ قبائلی خانہ جنگی شروع ہو جائے تو قریش کے معمر ترین شخص ابو اُمیہ بن مغیرہ نے تجویز پیش کی کہ کل بیت اللہ شریف میں سب سے پہلے داخل ہونے والے شخص کا فیصلہ سب کے لئے قابلِ قبول ہو گا۔ دوسرے دن سب آنحضور ﷺ کو داخل ہوتے دیکھ کر بیک زبان پکار اُٹھے "هٰذَا الْاَمِيْنُ، رَضِيْنَا، هٰذَا مُحَمَّدٌ" یعنی "یہ امین ہے۔ اس کے فیصلے پر ہم سب راضی ہیں۔ یہ تو اپنا محمدؐ ہے"۔ حضور اکرم ﷺ نے

اپنی چادر بچھا کر اس پر حجر اسود رکھا' پھر تمام اکابرین سے مطلوبہ بلندی تک اُٹھوا کر اپنے دست مبارک سے اسے نصب فرمادیا اور یوں اپنے تدبر و فراست سے قوم کو باہمی تصادم سے بچالیا۔ آپؐ کی اسی معاملہ فہمی اور تدبر کا حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا غلام میسرہ رطب اللسان تھا اور آپؐ کی اسی فراست و حکمت نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جیسی رئیسہ کو آپؐ سے نکاح پر آمادہ کیا۔

نبوت کے بعد مکی زندگی میں مخالفتوں کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ہم قبیلہ اور ہم رتبہ لوگ آقاؤں کی طرح سلوک روا رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کو غلاموں کی طرح دبایا جاتا ہے' جبکہ مسلمانوں میں اپنے حق پر ہونے کے باعث ایک احساس برتری اور جوش و جذبہ موجود ہے۔ اس صورتحال میں مسلمانوں کو اپنی قوم سے متصادم نہ ہونے دینا اور جوشیلے مسلمانوں کو سنبھالے اور سمیٹے رکھنا یقیناً آپؐ کے حسن تدبر کا منہ بولتا ثبوت اور بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی قلیل تعداد کا کفار کے ہاتھوں صفحۂ ہستی سے مٹ جانا یقینی تھا۔ اس صورتحال کو واضح کرنے کے لئے یہاں ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے۔ نبوت کے ڈھائی تین برس بعد کی بات ہے کہ ایک روز مشرکین کے کچھ نوجوانوں نے مسلمانوں کو مکّہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھتے دیکھا تو مرنے مارنے پر تل گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کو بھی غصہ آ گیا' انہوں نے ایک شخص کے سر میں اونٹ کی ہڈی کھینچ ماری جس سے اس کا سر پھٹ گیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا تاخیر دارِ ارقم کو مسلمانوں کے اجتماع اور دعوت و تبلیغ کا مرکز مقرر فرمایا۔

اسلام کی دعوت کو پھیلانے کا حکم ملا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدبر و منتظم ہستی نے نہایت نظم و ترتیب کے ساتھ اس سلسلے کو چلایا۔ سب سے پہلے اپنی ذات پر اسلام لاگو کیا' پھر اپنے گھر سے دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع کر کے اسے قریبی دوستوں' خاندانِ قریش اور دوسرے بستی والوں تک پہنچایا۔ بعد میں آپؐ کی توجہ باہر سے آنے والے حجاج اور قبائل عرب کی طرف مبذول ہوئی۔ یوں یہ چشمۂ فیض آگے بڑھتا اور قلوب کو سیراب کرتا چلا گیا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغ کا انداز بھی نہایت باوقار' پُر حکمت اور حیرت انگیز اثرات کا حامل ہوتا۔

دعوتِ اسلام کی راہ میں جب مخالفت' مصائب اور مشکلات کی حد ہو گئی تو نبوت کی

مردم شناس اور دُور رس نگاہ نے مکّہ کے دو "عمروں" میں سے ایک کی طاقت و حمایت کی ضرورت محسوس کی' ایک عمرو بن ہشام اور دوسرا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ۔ خوش بختی عمر بن خطاب کا راستہ دیکھ رہی تھی' اس لئے دعائے نبویؐ ان کے حق میں پوری ہوئی۔ بعد میں وقت نے ثابت کیا کہ عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق آپ ﷺ کا قیافہ کس قدر صحیح تھا اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس اسلام کے لئے کس قدر ناگزیر تھے۔ گاندھی جیسا متعصب ہندو کہا کرتا تھا کہ اسلام کی تاریخ میں عمر رضی اللہ عنہ کے دور کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ کی نگاہِ حق بیں نے جب دیکھا کہ اللہ کی بندگی کے لئے مکّہ شہر تنگ پڑ گیا ہے تو سازگار فضا کی طرف مراجعت اختیار کی۔ ہجرت کا یہ حکیمانہ فیصلہ تاریخ اسلام میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں علمائے مغرب نے ہجرتِ نبویؐ کو "فرار" سے تعبیر کیا ہے وہاں برناڈ شا جیسے مشہور دانشور نے اسے حضور اکرم ﷺ کا مدبرانہ فعل گردانا ہے۔

جہاں تک نبی کریم ﷺ کی انتظامی صلاحیتوں کا تعلق ہے' مکّہ میں تو ان کے اظہار کا موقعہ نہ ملا' البتہ ہجرت کے بعد ان کا خوب ظہور ہوا۔ حضور ﷺ کی مدینہ میں آمد کے وقت مدینہ کی آبادی اوس اور خزرج کے علاوہ دیگر یہودی قبائل پر مشتمل تھی۔ یہ قبائل عرصہ دراز سے باہم برسرپیکار چلے آ رہے تھے۔ اوس اور خزرج کی باہمی آویزش کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہجرت سے قبل مدینہ کے مسلمانوں کے لئے مکّہ سے امام بھیجنا پڑا تھا' کیونکہ یہ دونوں قبائل ایک دوسرے کی امامت و سیادت پر رضامند نہ تھے۔

ان حالات میں ان دو مخالف دھڑوں کو قابو میں رکھنا اور مدینہ میں ایک اسلامی ریاست کا قائم کرنا کس قدر مشکل امر ہو گا' لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذہانت و فطانت سے اس مشکل پر یوں قابو پایا کہ مدینہ کی آبادی کے مختلف عناصر کے نمائندوں کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے ایک مملکت کے قیام کی تجویز رکھی اور اکثریت کی آمادگی پر ایک تحریری معاہدہ طے پا گیا جو میثاق مدینہ کہلاتا ہے۔ دُنیا کے اس سب سے پہلے تحریری معاہدے کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک اُمی کے ہاتھوں وجود میں آیا۔ اس دستور کی ایک ایک شق آپؐ کی فراست و ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس معاہدے میں یہ بات احاطۂ تحریر میں

لائی گئی کہ ① مدینہ ایک آزاد و خود مختار مملکت ہو گی ② "للمسلمین دینھم وللیھود دینھم" کا فقرہ ظاہر کرتا تھا کہ ہر فریق کو مذہبی آزادی حاصل ہو گی ③ بیرونی دشمنوں سے یکجا اور متحد ہو کر مقابلہ کیا جائے گا ④ اجتماعی دفاع ہو یا داخلی مقدمات' آخری فیصلہ حضور نبی کریم ﷺ کا تسلیم کیا جائے گا۔ گویا جناب رسالت مآب ﷺ اس خود مختار مملکت یا قبائلی تنظیم کے اجتماعی طور پر سربراہ تسلیم کر لئے گئے۔

اس انتظام سے مطمئن ہونے کے بعد جناب رسالت مآب ﷺ نے مدینہ کے نواح کی طرف توجہ فرمائی اور دوروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ پہلا دورہ شمالی علاقوں کا کیا۔ تین دن کی مسافت پر قبیلہ جُہینہ آباد تھا۔ ان کے ساتھ ایک فوجی معاہدہ عمل میں لایا گیا جس میں اس عزم کا بصراحت اظہار تھا کہ بیرونی دشمنوں سے یکجا ہو کر نمٹیں گے۔ اسی قسم کے معاہدے مدینہ کے مشرقی اور جنوبی قبائل کے ساتھ بھی طے پائے۔ گویا مدینہ کی چھوٹی سی سلطنت کی حفاظت کے لئے ایک مدافعتی حصار قائم کر لیا گیا کہ دشمن اگر حملہ آور ہو بھی تو وہ بے روک ٹوک مدینہ تک نہ آ پہنچے' بلکہ اسے جابجا رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے۔ جنگی نقطۂ نظر سے یہ تدبیریں نہایت اہمیت کی حامل تھیں۔ صرف اسی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ نفسیاتی طور پر قریش کو مرعوب کرنے کے لئے ان کے تجارتی قافلوں پر اِکا دُکا حملے بھی شروع کئے گئے اور یوں ان کی خوشحالی' جو شمالی اور جنوبی علاقوں سے تجارت پر منحصر تھی' مخدوش کر ڈالی۔ دفاعی امور کا طویل باب چند لفظوں میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔ تاہم اب آتے ہیں تدبیر مملکت اور انتظامِ سلطنت کی طرف۔

کسی نوزائیدہ مملکت کے لئے مہاجرین کی بحالی اور معاشی خوشحالی کا مسئلہ کس قدر اہمیت کا حامل ہوتا ہے' پاکستانی اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اس قدر اہم اور سنگین مسئلے کا جس قدر آسان حل ڈھونڈا' اور جس تیزی سے اس پر عمل ہوا' اس پر ایک دُنیا انگشت بدنداں ہے۔ مؤاخات یعنی مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارے کا رشتہ قائم کیا۔ ہر انصاری صحابیؓ کے ذمے ایک ایک مہاجر بھائی کا تعلق قائم کر دیا گیا۔ پھر انصار نے ایثار و اخوت کی لازوال مثالیں قائم کیں۔ یوں مہاجرین کی بے وطنی اور تہی دستی کا باعزت علاج ہوا۔ مہاجرین کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی' اور نتیجتاً مہاجرین اور انصار کے درمیان اشتراک و تعاون کی

فضا پیدا ہوئی۔

مسجد و مکتب کو اسلام کی معاشرتی زندگی میں کس قدر اہمیت حاصل ہے' اس کا عملی مظاہرہ قبا اور مدینہ میں مساجد کی تعمیر سے کیا جا سکتا ہے۔ مسجد نبویؐ کے صحن میں صُفہ کا مدرسہ مسلمانوں کی پہلی اقامتی یونیورسٹی قرار پایا۔ صُفہ کی اسی درسگاہ سے فیوضِ نبویؐ سے براہِ راست مستفید ہونے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کی کھیپ کی کھیپ تیار ہو کر نکلی اور ہر شعبۂ حیات کو بے شمار نامور شخصیتیں ملیں' کبھی قحط الرجال محسوس نہ ہوا۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ عظیم و قد آور شخصیتوں کے قریبی لوگ ابھر نہیں پاتے جیسے تناور درخت کے زیر سایہ پودے قد نہیں نکال سکتے۔ لیکن یہ حضور ﷺ کا فیضانِ نظر تھا کہ جو قریب گیا وہ جوہر قابل بنا۔ پھر رسالت مآب ﷺ کی مردم شناس اور دور رس نظر نے ہر فرد کی اہلیت و قابلیت کو صحیح صحیح پرکھا۔ جس میں سیادت و قیادت کی صلاحیت دیکھی اسے فوج کی سپہ سالاری یا علاقے کی گورنری سے نوازا۔ کسی کو رشد و ہدایت میں آگے دیکھا تو اسے دعوت و تبلیغ کے کام پر لگایا۔ انصاف پسند شخصیتیں قاضی اور جج بنا کر بھیجی گئیں۔ غرضیکہ جو جس کام کا اہل نظر آیا اسی کام پر لگایا گیا۔ ہر شخص اپنے مقام پر یوں فٹ تھا جس طرح انگشتری میں نگینہ۔ دُنیا میں کسی قائد و مدبر کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ اسے دو چار ساتھی ایسے مل جائیں جو اس کے فکر و فلسفے کو آگے چلائیں۔ اس معاملے میں حضور نبی کریم ﷺ دُنیا کے خوش قسمت ترین انسان ہیں جنہیں بے شمار مخلص اور جاں نثار ساتھی میسر آئے۔

کسی دانشور کا قول ہے کہ منتشر انسانوں کو یکجا کرنا اور انسانی ذہنوں کو بدلنا دُنیا کے دو سب سے مشکل کام ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی اولوالعزمی' مستقل مزاجی اور تدبیر و تربیت سے یہ دونوں مشکل کام بآسانی کر دکھائے۔ ۲۰ سال کے قلیل عرصے میں یہ منتشر لوگ بنیانِ مرصوص بن چکے تھے اور ۴۰ سال کے عرصے میں دُنیا کے تین براعظموں پر چھا چکے تھے۔ یہ سب حضور ﷺ کی تربیت و توجہ کے طفیل تھا۔

مدینہ کی مملکت شروع میں صرف مدینہ کے شہر تک محدود تھی' بعد میں اس کی حدود میں اس تیزی سے توسیع ہوئی کہ صرف دس سال میں مدینہ ایک وسیع و عریض اسلامی مملکت کا دارالخلافہ بن گیا۔ امورِ سلطنت کی تکمیل کے لئے پڑھے لکھے اور تجربہ کار صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم پر مشتمل ایک محکمۂ دیوان قائم کیا گیا جسے آج کی زبان میں سیکرٹیریٹ کہہ سکتے ہیں۔ ان کاتبوں کے ذمے کتابتِ وحی سے لے کر بیت المال کا حساب' مالِ غنیمت کا اندراج' مستحقین زکوٰۃ اور صاحب نصاب لوگوں کی فہرستیں' بالغ اور قابل جنگ مردوں کے نام و پتے' سب معاملات کا ریکارڈ رکھنا تھا۔ انہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذمے عرب و عجم کے سلاطین کے نام خطوط کی کتابت اور ترسیل کی اہم ذمہ داری بھی تھی۔

اب ان خطوط کا بھی ذرا تفصیل سے ذکر ہو جائے' جن کا رواج سے ہٹا طرزِ تحریر' معمول سے مختلف اندازِ تخاطب اور مضمون کا لب و لہجہ' سب کچھ مکتوب الیہ کو چونکا دینے کے لئے کافی تھا۔ پہلے زمانے میں بادشاہوں کے نام و القاب سے خطوط شروع اور مبالغہ و خوشامد پر ختم ہوتے تھے' خط بھیجنے والے کا نام آخر میں درج ہوتا تھا' جبکہ خطوطِ نبوی میں "اللہ کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے شاہ مقوقس یا شاہ نجاشی کے نام" سے خط کی ابتداء ہوتی۔ یہ طرز تحریر ہی نفسیاتی طور پر پہلی کامیابی کا پیش خیمہ بنتا۔ بادشاہ اور والیانِ ریاست سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ جو شخص اس بیباکی سے شہنشاہوں کو مخاطب کر رہا ہے وہ کس قدر طاقت و قوت کا مالک ہو گا۔ حیرت ہے آپ کیسے اُمی تھے کہ ماہرین تعلیم سے بڑھ کر قابل اور ماہرین نفسیات سے زیادہ انسانی نفسیات کو جاننے والے تھے۔

حضور ﷺ کی سیاسی بصیرت اور فہم و فراست کی معراج صلح حدیبیہ ہے۔ چھ ہجری میں حضور نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ قربانی کے جانوروں سمیت عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ روانہ ہوئے۔ حدیبیہ کے مقام پر مکہ والے مزاحم ہوئے۔ اس موقع پر ایک صلح نامہ لکھا گیا۔ بظاہر یوں محسوس ہوتا تھا کہ معاہدہ دب کر کیا گیا ہے اور توہین آمیز شرائط طے ہوئی ہیں' لیکن بعد میں وقت نے ثابت کیا کہ یہ صلح مسلمانوں کے لئے فتح مبین تھی۔ حضور نبی کریم ﷺ کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ مسلمان دو دشمنوں کے درمیان پھنسے ہوئے ہیں' ایک طرف قریش مکہ اور دوسری طرف یہود مدینہ۔ ایک عقلمند حکمران دو دشمنوں سے نمٹنے اور انہیں متحد ہونے سے روکنے کے لئے ایک دشمن سے معاہدہ کر لیتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے یہی کیا۔ پھر دو دشمنوں میں سے صلح کے لئے کسے منتخب کیا جائے؟ قریش مکہ کا انتخاب ہر حال میں درست تھا کہ جانے بوجھے اپنے ہم قوم اور ہم زبان تو تھے۔ معاہدہ کی ایک شق بظاہر سبکی آمیز تھی کہ جو شخص مدینہ سے مکہ جائے گا

واپس نہیں کیا جائے گا۔ دیکھا جائے تو مدینہ سے کوئی مرتد ہی واپس مکّہ جا سکتا تھا اور مرتد بے دین ہمارے کس کام کے؟ بلکہ ایسے لوگوں کا مدینہ میں رہنا خطرناک تھا۔ پھر یہ شرط کہ فریقین عرب قبائل سے معاہدہ کرنے میں آزاد ہوں گے' اس میں تو مسلمانوں کا سراسر فائدہ مضمر تھا۔ گویا مشرکین مکّہ نے لاشعوری طور پر مسلمانوں کی سیاسی قیادت اور طاقت کو پہلی بار تسلیم کر لیا اور اپنے برابر کا فریق مانا۔ چنانچہ اس کے بعد بنو خزاعہ جیسے طاقتور قبیلہ کا مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ ہوا۔ اس طرح مسلمانوں کی سیاسی قوت اور شہرت میں اضافہ ہوا۔ پھر یہ صلح فی الحقیقت فتح مبین تھی۔ ایک سال بعد مسلمانوں کو طواف و زیارتِ کعبہ کا شرف حاصل ہوا اور مشرکین مکّہ سے بے فکر ہو کر یہود مدینہ کی سرکوبی کا موقع ملا۔ خیبر کا قلعہ فتح ہوا اور سب سے بڑی بات یہ کہ امن و امان کی فضا میسر آئی تو تبلیغ دین کا موقع ملا۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں والیانِ ممالک کو خطوط بھجوائے گئے۔ تاریخ شاہد ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد جس قدر لوگ مسلمان ہوئے' پچھلے اٹھارہ برسوں میں نہ ہوئے تھے۔ حضرات خالد بن ولید اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما جیسے بہادر سپہ سالار بھی صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہوئے۔ حیرت ہوتی ہے کہ چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن باتوں کی گہرائی کو نہ پہنچے حضور والا صفات لمحوں میں کیسے پہنچ گئے' یقیناً اس کے پیچھے حضور نبی کریم ﷺ کی پیغمبرانہ بصیرت اور مدبرانہ فراست کا ہاتھ تھا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فوجی حکمت عملی کی تفصیلات بتانے کی یہاں گنجائش نہیں' بس ایک خاص بات قابل توجہ ہے کہ آپؐ نے ہمیشہ دشمن کو حیران و بے بس کیا' خواہ بدر میں صفوں کی ترتیب ہو یا اُحد میں میدانِ جنگ کا انتخاب' احزاب میں خندق کا کھودنا ہو یا فتح مکّہ کے موقع پر عام معافی کا اعلان' ہمیشہ اپنی صفت اختراع سے دشمن کو چونکا دیا۔ پھر ہر غزوہ اور معرکہ کی اپنی ایک خصوصیت قائم رکھی' جس سے جناب رسول اللہ ﷺ کی فوجی بصیرت اور مدبرانہ فراست کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً غزوہ بدر میں بدر کے کنوئیں پر پڑاؤ' اُحد میں شکست خوردہ فوج کو ہزیمت کے برے اثرات اور ڈیمورالائز ہونے سے بچا لینا' غزوہ خندق میں جنگ کو طول دے کر دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کر دینا اور مکّہ میں داخلہ کے وقت فاتح فوج پر مکمل کنٹرول۔

جنگ کے موقعوں پر جناب رسالت مآب ﷺ کی جزئیات پر بھی نظر رہتی تھی۔ فوج

کی تیاری سے لے کر اسلحہ کی فراہمی تک' سامانِ خورد و نوش ہو یا سواری کے جانور' ہر بات پیش نظر رہتی' یہاں تک کہ اس بات کا بھی خیال فرماتے کہ مسلمان فوج کا رُخ ایسا ہو کہ آفتاب آنکھوں کے سامنے نہ آئے' ہوا پیچھے چل رہی ہو سامنے کی نہ ہو' میدان کی بلندی کی طرف کھڑے ہوں' ڈھلوان کی جانب نہ ہوں۔

ایک اور بات جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں' جناب رسالت مآب ﷺ کی وہ عادتِ مبارکہ ہے کہ کسی مہم پر روانگی کا وقت اور مقام ہمیشہ پوشیدہ رکھتے' یہاں تک کہ میدانِ جنگ تک جا پہنچتے تب صحابہؓ آگاہ ہوتے۔ یہ احتیاط اور چوکسی عظیم قائدانہ صلاحیت کی دلیل ہے۔ غزوۂ احزاب کے دوران کے ایک واقعے کا بیان یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دورانِ محاصرہ اطلاع پہنچی کہ بنو نضیر کے بہکانے پر یہودیوں کا قبیلہ بنو قریظہ' جو ابھی تک مدینہ میں موجود تھا' قریش مکہ سے مل گیا ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرات سعدین یعنی سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما کو خبر کی تصدیق کیلئے بنو قریظہ کے ہاں بھیجا۔ اب یہ خبر چونکہ انتہائی ہمت شکن تھی لہٰذا حضرات سعدین کو تاکید فرمائی کہ اگر خبر غلط ہو تو سب کے سامنے آکر بتانا' اور بالفرض بنو قریظہ نے واقعتاً عہد شکنی کی ہو تو چپکے سے مجھے آ کر اطلاع دینا' باقی مسلمان آگاہ نہ ہونے پائیں۔ صاحب تدبر اور فریس سپہ سالار کو اندازہ تھا کہ حالتِ جنگ میں اس قسم کی افواہیں کس قدر دلدوز و حوصلہ شکن ہوتی ہیں اور فوج کا مورال اونچا کرنے کیلئے اچھی اور خوش آئند خبریں کتنا اثر رکھتی ہیں۔

جناب رسالت مآب ﷺ کی ان جزئیات پر توجہ صرف جنگ کے دوران ہی نہ رہتی بلکہ عام زندگی میں روزمرہ کے مسائل پر بھی ایسی ہی نظر رکھتے۔ مثلاً مکانوں کے بارے میں کہ اتنے اونچے نہ بناؤ کہ ہمسایوں کی ہوا اور روشنی رُکے' یا سڑکوں کے بارے میں کہ مکانوں کے درمیان گلیوں کو اتنا چوڑا رکھو کہ دو لدے ہوئے جانور باآسانی گزر سکیں۔

فتح مکہ کے موقع پر تاریخ انسانیت ایک عجیب و غریب تجربے سے دوچار ہوئی ہے۔ اس عظیم انقلاب کی ہربات نرالی تھی۔ ایک شخص' جو رات کی تاریکی میں اپنے ایک ساتھی کے ساتھ چھپ کر بستی چھوڑتا ہے' بلکہ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے' و

فاتحانہ شان کے ساتھ ایک لاکھ سے زائد ساتھیوں کے ہمراہ دن کے وقت علی الاعلان واپس آتا ہے۔ فی الحقیقت دُنیا میں حضور نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر کوئی کامیاب فاتح نہیں گزرا۔ دوست' دشمن حیران رہ گئے جب آپؐ نے ابو سفیان جیسے دشمن کے گھر کو جائے امن و پناہ قرار دیدیا۔ اور ﴿ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ﴾ فرما کر عام معافی کا اعلان کیا۔ حضور اکرم ﷺ کی شجاعانہ فطرت اور نبوی فراست کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ بہادر لوگ طاقت سے نہیں احسان سے تسخیر کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ مکّہ والوں کے دلوں کو تسخیر کرنے میں بدر' اُحد اور احزاب کے معرکوں نے وہ کام نہ کیا جو اس عام معافی کے اعلان نے کر دکھایا۔

دُنیا میں چھوٹے سے چھوٹا انقلاب آئے یا نظریاتی تصادم ہو' ہزاروں بلکہ لاکھوں جانیں ضائع ہوتی ہیں' مال و منال کا تو تذکرہ ہی کیا' لیکن جو انقلاب حضور ﷺ کے ہاتھوں برپا ہوا اس میں کل مسلمان شہداء اور تمام غزوات میں دشمن مقتولین کی تعداد چند سو سے زائد نہیں بنتی۔ یقیناً یہ جناب رسالت مآب ﷺ کی مدبرانہ سیاست کا عظیم کارنامہ ہے۔ آج ہماری دُنیا میں سیاست مکاری اور چالاکی کا دوسرا نام ہے۔ آج کامیاب سیاستدان وہ ہے جو جس قدر ہو سکے جھوٹ اور پروپیگنڈے سے سیاہ کو سفید منوالے۔ حضور نبی کریم ﷺ دُنیا کے واحد مدبر سیاستدان تھے جنہیں کوئی مصلحت و حکمت جھوٹ پر آمادہ نہ کر سکی۔ سیاست میں عبادت کی سی دیانت اختیار کی اور کامیاب رہے۔ کم ذرائع و اسباب کے ساتھ قلیل مدت میں کثیر کامیابی حاصل کی۔ اس سے بڑھ کر اور تدبر کیا ہو گا۔ فی الحقیقت حضور اکرم ﷺ ایسے عظیم مدبر اور منتظم تھے کہ تاریخ انسانی اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

ضرورت رشتہ

ایم ایس سی ایم فل 30 سالہ دوشیزہ قریشی فیملی کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر' انجینئر یا کم از کم ایم ایس سی بلا تفریق ذات پات موزوں رشتہ درکار ہے۔

رابطہ : سردار اعوان' 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700

فون : 5869501-3

نماز میں خشوع

حقیقت واہمیت اور اسباب

تالیف : الاستاذ محمد بن صالح المنجد حفظہ اللہ
ترجمہ و تفہیم : ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور عفی اللہ عنہ

الحمد للّٰہ ربِّ العالمین الّذی قال فی کِتابہ المبین : ﴿ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ﴾ وقال عن الصلاۃ : ﴿ وَاِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِیْنَ ﴾ والصّلاۃ والسّلام علٰی اِمام المتقین و سیّد الخاشعین محمد رسول اللّٰہ وعلٰی آلہ وصحبہ اجمعین ـــــ وبعد :

دین کے عملی ارکان میں سب سے اہم رکن نماز ہے اور نماز میں خشوع اختیار کرنا شریعت کا حکم ہے۔ اُدھر شیطانِ لعین نے پہلے روز سے عہد کر رکھا ہے کہ بنی آدم کو گمراہ کر کے چھوڑے گا' قرآن حکیم نے شیطان کے چیلنج کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

﴿ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ ﴾ (الاعراف : ۱۷)

"پھر میں آگے اور پیچھے' دائیں اور بائیں' ہر طرف سے ان کو گھیروں گا"۔

مختلف وسائل اور ذرائع کے ذریعے شیطان کی سب سے بڑی کوشش یہی رہی ہے کہ لوگوں کو باخشوع نماز سے دور کر دے تاکہ لوگ ایک طرف اس عبادت کی لذت سے محروم ہو جائیں اور دوسری طرف اجر و ثواب سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ چونکہ بہت سارے لوگ شیطان کی یہ بات مان چکے ہیں ـــــ اور چونکہ سب سے پہلے زمین سے خشوع ہی کو اُٹھایا جائے گا اور ہم تو آخری زمانے میں آئے ہیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا قول ہم پر سچا ثابت ہو رہا ہے کہ :

"سب سے پہلے دین میں خشوع رخصت ہو گا اور سب سے آخر میں نماز' ایسا نمازی بھی ہو گا جس میں کوئی بھلائی نظر نہ آئے گی۔ اور وہ وقت دور نہیں کہ تم

مسجد میں جاؤ اور ایک آدمی بھی خشوع کے ساتھ نماز پڑھنے والا نہ ملے"۔[1]

انسان خود اپنے بارے میں بھی محسوس کرتا ہے اور گرد و پیش کے لوگ بھی شکایت کرتے ہیں کہ نماز میں وسوسے بہت آتے ہیں اور خشوع کی کمی ہے' چنانچہ اس موضوع پر قلم اُٹھانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔

سب سے پہلے میں اس کتابچے کے ذریعے اپنے آپ کو یاد دہانی کرانا چاہتا ہوں اور اس کے بعد اپنے مسلمان بھائیوں کو حقیقت خشوع بتلانا چاہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ میری اس کوشش کو فائدہ مند بنادے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ○ ﴾

(المومنون : ۱-۲)

"ایسے اہل ایمان یقیناً کامیاب ہو گئے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں"۔

خشوع کا اصطلاحی مفہوم

"خشوع نام ہے سکون و اطمینان اور وقار و تواضع کے ساتھ (نماز کی) ادائیگی کا اور خشوع کا سبب اللہ کا خوف اور اس کی نگرانی کا خطرہ ہو"۔[2]

خلاصہ یہ ہوا کہ "خشوع ایسی کیفیت کا نام ہے کہ دل عاجزی و انکساری کے احساس کے ساتھ اللہ رب العالمین کے سامنے کھڑا ہو"۔[3]

﴿ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴾ (البقرۃ : ۲۳۸) "اللہ کے حضور عاجزی سے کھڑے رہو"۔ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت مجاہد رحمہ اللہ "قنوت" کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

"قنوت یہ ہے کہ اللہ کے خوف کی وجہ سے جسم پُرسکون ہو' دل ڈر رہا ہو' آنکھیں جھکی ہوئی ہوں اور پہلو نرم پڑ چکے ہوں"۔[4]

اگرچہ خشوع کی اصل جگہ تو دل ہے لیکن اس کے اثرات اعضاء و جوارح پر ہوتے ہیں کیونکہ جسمانی اعضاء دل کے تابع ہوتے ہیں۔ جب غفلت یا وسوسے کی وجہ سے دل کا خشوع ختم ہو جائے تو اعضاء و جوارح کی کیفیت عبادت بھی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ دل کی حیثیت بادشاہ کی ہے اور اعضاء لشکر کی حیثیت رکھتے ہیں' یہ دل کی بات

مانتے ہیں اور اس کے حکم کے مطابق کام کرتے ہیں۔ جب دل احساسِ بندگی سے محروم ہو گیا تو گویا کہ بادشاہ معزول کر دیا گیا ہے لہٰذا اس بادشاہ کی رعایا بھی ضائع ہو جائے گی۔ البتہ بناوٹی اور مصنوعی خشوع کا مظاہرہ کرنا تو سخت ناپسندیدہ ہے کیونکہ یہ نفاق کی علامتوں میں سے ہے۔

خشوع کو پوشیدہ رکھنا

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے : "منافقانہ خشوع سے بچ کر رہو" کسی نے دریافت کیا: "منافقانہ خشوع کیا ہوتا ہے؟" فرمایا: "جسم پر تو خشوع نظر آئے اور دل خشوع سے فارغ ہو"۔ حضرت الفضیل بن عیاض رحمہ اللہ کہتے ہیں : "یہ بات مکروہ ہے کہ آدمی اتنے خشوع کا مظاہرہ کرے جتنا کہ دل میں نہ ہو"۔ ایک صاحب علم نے کسی کو کندھے جھکائے دیکھا تو سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا : "اے فلاں! خشوع یہاں ہوتا ہے، نہ کہ کندھوں میں۔"(۵)

امام ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ نے ایمان بھرے خشوع اور منافقانہ خشوع میں فرق ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

"ایمان بھرا خشوع وہ ہے جس میں دل اللہ کے حضور ڈر رہا ہو اس کی عظمت اور جلال کی وجہ سے، وقار، ہیبت اور حیا کے ساتھ۔ چنانچہ دل خوف، شرمندگی، محبت اور حیا کے ساتھ ٹوٹا جا رہا ہو، اللہ کی نعمتیں یاد کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی کوتاہیوں کا بھی اعتراف ہو۔ نتیجتاً دل میں لازماً خشوع پیدا ہو جائے گا اور دل میں خشوع کے نتیجے میں اعضاء و جوارح پر بھی خشوع طاری ہو جائے گا۔ اس کے برعکس منافقانہ خشوع یہ ہوتا ہے کہ جسمانی اعضاء پر تو بناوٹی اور منافقانہ خشوع نظر آتا ہے اور دل میں خشوع کی کیفیت نہیں ہوتی۔

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ جملہ ثابت ہے : "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ خُشُوْعِ النِّفَاقِ" (میں منافقانہ خشوع سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں) پوچھا گیا منافقانہ خشوع سے آپ کی کیا مراد ہے؟ فرمایا: "کہ جسم پر خشوع کی شکل نظر آئے اور دل خشوع سے خالی ہو"۔ چنانچہ صحیح معنیٰ میں اللہ کا خشوع رکھنے والا بندہ تو وہ ہے جس کی شہوات کی آگ ٹھنڈی ہو چکی ہو، دل سے اس کا دھواں بھی بجھ چکا ہو، عظمت خداوندی کا نور اس کے سینے میں جگمگا اٹھا ہو،

اللہ کا خوف اور وقار اس کے سینے میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہو جس کی وجہ سے اس کی نفسیاتی خواہشات مر چکی ہوں، جسمانی اعضاء کی اکڑ نکل چکی ہو، دل وقار سے بھر گیا ہو، اللہ سے لو لگا کر اسے اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہو، جو سکون و اطمینان اللہ کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہو اس کی چھاؤں میں وہ اللہ کو یاد رکھتا ہو اور اس حال پر راضی و خوش ہو۔ اس کیفیت کی نشانی یہ ہے کہ اللہ کے جلال و عظمت کی خاطر وہ سجدہ ریز ہوتا ہو اور اپنے آپ کو بہت حد تک جھکا کر اور کمزور سمجھ کر اللہ کے حضور سجدہ میں گرتا ہو اور اُس وقت تک سجدہ سے سر نہ اُٹھاتا ہو جب تک رب سے ملاقات کا لطف نہ لے لیتا ہو۔ ایمان بھرے خشوع کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ البتہ متکبر دل کا حال کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ متکبر اپنے تکبر اور گھمنڈ میں ہی اِترا تا رہتا ہے۔ اس کی مثال اس سخت اور ترچھی زمین کی ہے جس پر پانی ٹکتا ہی نہیں۔

اس کے برعکس منافقانہ خشوع میں تصنع اور دکھلاوے کے سکون کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ دل اندر سے برائی کے لئے تیار اور شہوتوں کا طلبگار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ظاہر میں خشوع نظر آتا ہے اور اندرون خانہ وادی کے سانپ یا جنگل کے شیر کی طرح موقع کی تاک میں ہوتا ہے کہ جونہی شکار ہاتھ لگا اس پر حملہ کر دیا۔

نماز میں خشوع صرف اس آدمی کو نصیب ہو سکتا ہے جس نے اپنے دل کو نماز کے لئے فارغ کر لیا ہو اور دوسرے سارے کام چھوڑ کر اس میں لگ گیا ہو اور ہر کام کے مقابلے میں نماز اسے عزیز تر ہو۔ صرف اسی صورت میں نماز اس کے دل کا سکون اور آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے :

((.... جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلَاةِ)) (۶)

"میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحزاب آیت ۳۵ میں فرمایا کہ خشوع اختیار کرنا میرے نیک بندوں کی نشانی ہے اور اسی میں لوگوں کے لئے مغفرت کا وعدہ اور اجر عظیم کی بشارت ہے۔

خشوع کے متعدد فوائد میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ نماز کی ادائیگی بندے کے لئے آسان ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ ﴾

(البقرة : ۴۵)

"اور (مصائب جھیلنے کے لئے) صبر اور نماز سے مدد لو۔ اور یہ یقیناً کٹھن کام ہے البتہ خشوع اختیار کرنے والوں کے لئے مشکل نہیں ہے"۔

معلوم ہوا کہ خشوع کا مقام بہت نادر ہے کیونکہ بہت جلد یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے اور بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور خاص طور پر اس زمانے میں خشوع عنقا ہو گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((اَوَّلُ شَیْءٍ یُرْفَعُ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الْخُشُوْعُ حَتّٰی لَا تَرٰی فِیْهَا خَاشِعًا)) (۷)

"اِس اُمت میں سب سے پہلے خشوع ختم ہو گا' وہ زمانہ بھی آئے گا کہ تمہیں ایک بھی خشوع والا آدمی نظر نہ آئے گا"۔

سلف صالحین میں سے کسی کا قول ہے : نماز کی مثال لونڈی یا باندی کی ہے جو شہنشاہوں کے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ تمہارا اُس آدمی کے بارے میں کیا خیال ہے جو فالج کی ماری یا ایک آنکھ سے معذور یا بالکل اندھی یا ہاتھ یا پاؤں کٹی یا مریضہ یا بدشکل یا مُردہ لونڈی شہنشاہِ عالم کے حضور پیش کرے؟ لہٰذا ایسی لونڈی کی مانند نماز کا کیا فائدہ جسے تقرب الٰہی کی خاطر ایک بندہ اللہ کے حضور پیش کرے؟ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس تو طیب ہے اور وہ صرف طیب چیز ہی قبول فرماتا ہے' اور یہ کوئی طیب کام نہیں ہے کہ نماز تو ہو لیکن اس میں روح نہ ہو۔ اسی لئے مردہ غلام کو آزاد کرنے کو صحیح معنی میں کسی کو آزاد کرنا نہیں کہا جا سکتا۔ (مدارج السالکین ۵۲۶/۱)

خشوع کا حکم

راجح بات یہی ہے کہ خشوع واجب ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے : ﴿ وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ ۝ ﴾ (البقرة : ۴۵) "اور صبر و نماز کے ذریعے تم مدد طلب کرو اور یہ نماز کی ادائیگی بھاری ہے سوائے خشوع کرنے والوں کے"۔ جو لوگ خشوع نہیں کرتے اس آیت میں ان کی مذمت ہے اور مذمت اسی وقت ہوتی ہے جب کوئی فرض یا واجب ترک کرے یا حرام کام کا ارتکاب کرے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خشوع واجب ہے۔

خشوع کے واجب ہونے کی دوسری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے :

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ○ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ○ ﴾

(المومنون : ۱-۲)

"یقیناً فلاح پائی ان اہل ایمان نے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں"۔

آگے چل کر فرمایا :

﴿ اُولٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ○ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ○ ﴾ (المومنون : ۱۰-۱۱)

"یہی لوگ وارث ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے' اس میں وہ لوگ ہمیشہ رہیں گے"۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بتایا ہے کہ صرف ان صفات کے حامل لوگ ہی فردوس میں جائیں گے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ ان صفات کے مالک نہیں ہوں گے وہ فردوس میں نہیں جا سکیں گے۔ اور جب یہ طے ہو گیا کہ خشوع نماز میں واجب ہے اور خشوع سکون و انکساری کا نام ہے تو جس نے کوے کی طرح ٹھونگے مارے وہ سجدوں میں خشوع اختیار نہ کر سکا۔ اسی طرح جس نے پوری طرح رکوع سے سر نہ اُٹھایا بلکہ سیدھا نیچے چلا گیا اس نے بھی سکوں سے کام نہیں لیا کیونکہ سکون اطمینان ہی کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ جس نے اطمینان سے کام نہیں لیا اس نے سکون اختیار نہیں کیا اور جس نے پرسکون طریقے سے کام نہیں کیا اس نے رکوع اور سجدے میں خشوع کو نہیں اپنایا اور جس نے خشوع اختیار نہیں کیا وہ گنہگار اور نافرمان ٹھہرا۔ نماز میں خشوع کا وجوب رسول اللہ ﷺ کی تنبیہ اور وعید سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ آسمان کی طرف نگاہ اُٹھانا حالت خشوع کے منافی ہے۔ جب آپ ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھانے والے کو وعید سنائی ہے تو معلوم ہوا کہ خشوع واجب ہے۔ (۸)

خشوع کی فضیلت اور عدم خشوع پر وعید' دونوں صورتیں مندرجہ ذیل حدیث سے واضح ہو جاتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا :

((خَمْسُ صَلَوَاتٍ افْتَرَضَهُنَّ اللّٰهُ تعالٰی' مَنْ اَحْسَنَ وُضُوْءَهُنَّ وَصَلَّاهُنَّ لِوَقْتِهِنَّ وَاَتَمَّ رُكُوْعَهُنَّ وَخُشُوْعَهُنَّ كَانَ لَهٗ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ

اَنْ يَغْفِرَ لَهٗ وَمَنْ لَمْ يَفْعَلْ فَلَيْسَ لَهٗ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ اِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهٗ وَاِنْ شَاءَ عَذَّبَهٗ))(۹)

"اللہ تعالیٰ نے (بندوں پر) پانچ نمازوں کو فرض کیا ہے' جو آدمی اچھی طرح ان نمازوں کا وضو کرے اور انہیں وقت پر پڑھے' رکوع اور خشوع کا پورا طرح خیال رکھے' اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لے لیا ہے کہ اسے بخش دے گا اور جو آدمی یہ نہ کرے اس کا اللہ پر کوئی ذمہ نہیں' چاہے اسے بخش دے اور چاہے سزا دے"۔

خشوع کی فضیلت میں رسول اللہ ﷺ نے یوں بھی فرمایا :

((مَنْ تَوَضَّاَ فَاَحْسَنَ لْوُضُوءَ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ يُقْبِلُ عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهٖ وَوَجْهِهٖ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ))(۱۰)

"جس کسی نے اچھی طرح سے وضو کیا' پھر دو رکعت نماز ادا کی' اپنے دل اور چہرے کو نماز پر متوجہ رکھا تو اس کے سابقہ سارے گناہ معاف کر دیئے گئے"۔

اسبابِ خشوع

جب ہم نے نماز میں خشوع کے اسباب جمع کرنے شروع کئے تو معلوم ہوا کہ یہ اسباب دو طرح کے ہیں :

① ایسے اسباب کا حصول جو خشوع پیدا کرتے ہیں اور اسے مضبوط بناتے ہیں۔

② ایسے اسباب سے بچنا جو خشوع کو ختم کرتے ہیں یا اسے کمزور کرتے ہیں۔

جو کام خشوع کے لئے معاون بنتے ہیں ان کو بیان کرتے ہوئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا :

دو قسم کے کام خشوع کے لئے معاون ہیں: (۱) خشوع پیدا کرنے والے اسباب طاقتور ہوں۔ (۲) اور خشوع سے دور کرنے والے اسباب کمزور ہوں۔

① <u>خشوع پیدا کرنے والے اسباب کا طاقتور ہونا</u> : خشوع پیدا کرنے والے اسباب کے طاقتور ہونے سے مُراد ہے کہ بندہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے کوشش کر کے سمجھے اور جو کچھ کر رہا ہے اس کی بھی اسے خبر ہو۔ قراءت' ذکر اور دعا کے الفاظ و معانی پر غور

کرے اور اس کے ذہن میں یہ بات ہر دم تازہ ہو کہ وہ اللہ رب العالمین سے گفتگو کر رہا ہے' کیونکہ نمازی جب کھڑا نماز پڑھ رہا ہو تو وہ اپنے رب سے باتیں کر رہا ہوتا ہے۔

"احسان" کی کیفیت آپ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمائی :

((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ))(۱۱)

"تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو' اگر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی تو کم سے کم یہ خیال ضرور رہے کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے"۔

پھر بندہ جس قدر نماز کی لذت کو محسوس کر لے گا تو اسی نسبت سے وہ نماز کی طرف کھنچتا چلا جائے گا۔ اس بات کا دار و مدار ایمان کی طاقت پر ہے اور ایمان کو مضبوط کرنے والے کام بہت زیادہ ہیں۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کرتے تھے :

((حُبِّبَ اِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمُ النِّسَاءُ وَالطِّيْبُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلَاةِ)) (۱۲)

"تمہاری دنیا سے مجھے عورتیں اور خوشبو زیادہ پسندیدہ ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے"۔

نیز فرمایا:

((اَرِحْنَا بِالصَّلَاةِ يَا بِلَالُ)) (۱۳)

"اے بلال! ہمارے لئے نماز کے ذریعے راحت کا سامان کرو"۔

② خشوع کے آڑے آنے والے کاموں کو ختم کرنا : جن غیر ضروری چیزوں کے بارے میں انسان سوچتا رہتا ہے پوری کوشش کر کے ایسی چیزوں کی یاد کو دل سے دور کرنا۔ لہٰذا جو کام انسان کو مقصد نماز سے ہٹا دیتے ہیں ان پر غور کرنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں ہر انسان کا معاملہ الگ ہوتا ہے۔ کثرت سے وسوسے اسی انسان کو ہوتے ہیں جس میں شبہات کی کثرت ہو' شہوات میں گھرا ہوا ہو اور دل ایسی محبوب چیزوں میں اٹکا ہوا ہو جن کو پانے کے لئے دل بے چین ہو یا دل ایسی ناپسندیدہ چیزوں میں پھنس گیا ہو جن سے جان چھڑانا ضروری ہو"۔ (۱۴)

مذکورہ بالا تقسیم کی روشنی میں ہم نماز میں خشوع پیدا کرنے والے چند اسباب بیان کرتے ہیں :

ل) خشوع پیدا کرنے یا مضبوط کرنے والے کاموں کا اہتمام کرنا

① نماز کی تیاری : نماز کے لئے تیاری کے ضمن میں کئی کام آتے ہیں' مثلاً :

- مؤذن کے ساتھ ساتھ کلماتِ اذان کو دہرانا۔
- اذان کے بعد کی مسنون دُعا پڑھنا' جو کہ یہ ہے :

((اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ آتِ مُحَمَّدًا الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَحْمُوْدًا الَّذِي وَعَدْتَهُ)) (۱۵)

- اذان و اقامت کے درمیان دُعا کرنا۔ عمدہ طریقے سے وضو کرنا کہ شروع میں "بِسْمِ اللّٰهِ" پڑھی جائے اور بعد میں مسنون اذکار پڑھے جائیں' مثلاً ((اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ)) (۱۶) دوسری دعا یہ ہے : ((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ)) (۱۷)
- مسواک کا اہتمام کرنا۔ اس طرح سے منہ صاف ستھرا ہو جائے گا' کیونکہ تھوڑی دیر بعد قرآن کریم کی تلاوت کرنی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے : ((طَهِّرُوْا اَفْوَاهَكُمْ لِلْقُرْاٰنِ)) (۱۸) "اپنے منہ کو قرآن کی خاطر پاکیزہ بناؤ"۔
- صاف ستھرے کپڑے پہن کر اپنی زینت کا اہتمام کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے : ﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ (الاعراف : ۳۱) "اے اولادِ آدم! ہر نماز کے وقت اپنی زینت کا اہتمام کرو"۔ اور اللہ تعالیٰ کا زیادہ حق بنتا ہے کہ اس کی خاطر زینت کا اہتمام کیا جائے۔ علاوہ ازیں اچھا صاف ستھرا کپڑا پہننا ذہنی سکون کا موجب ہوتا ہے' جبکہ کام کاج یا سونے کے کپڑے الجھن پیدا کرتے ہیں۔
- لباس ساتر ہو' جگہ پاک ہو' بروقت گھر سے نکلا جائے' مسجد کی طرف آرام اور وقار سے جایا جائے' انگلیاں نہ چٹخائی جائیں اور نماز کا انتظار کیا جائے۔ یہ سارے کام نماز کی تیاری میں شامل ہیں۔
- صفیں سیدھی بنائی جائیں اور مل کر کھڑے ہوں' کیونکہ صفوں کے درمیان خالی جگہوں میں شیطان گھس آتے ہیں۔

② نماز میں اطمینان و سکون : رسول اللہ ﷺ نماز میں پُرسکون طریقے سے کھڑے ہوتے تھے' یہاں تک کہ ہر ہڈی اپنی طبعی جگہ پر آجاتی تھی [19] نماز میں کوتاہی کرنے والے کو بھی آپؐ نے اطمینان و سکون کا حکم دیا اور فرمایا :

((لَا تَتِمُّ صَلاَةُ اَحَدِكُمْ حَتّٰى يَفْعَلَ ذٰلِكَ)) [20]

"تم میں سے کسی کی نماز اُس وقت تک پوری نہیں ہوگی جب تک وہ اس طرح نماز ادا نہ کرے"۔ (یعنی پُرسکون اور اطمینان سے نماز ادا کرے)

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((اَسْوَأُ النَّاسِ سَرِقَةً الَّذِيْ يَسْرِقُ مِنْ صَلاَتِهٖ)) قَالَ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! كَيْفَ يَسْرِق صَلاَتَه؟ قال : ((لَا يُتِمُّ رُكُوعَهَا وَلَا سُجُودَهَا)) [21]

"سب سے بُرا چور نماز کا چور ہے"۔ کسی نے پوچھا: وہ کس طرح نماز کی چوری کرتا ہے؟ فرمایا: "نہ اس کا رکوع صحیح طریقے سے کرتا ہے اور نہ سجدہ"۔

حضرت ابو عبداللہ الاشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((مَثَلُ الَّذِيْ لَا يُتِمُّ رُكُوْعَهٗ وَيَنْقُرُ فِيْ سُجُوْدِهٖ مَثَلُ الْجَائِعِ يَأْكُلُ التَّمَرَةِ وَالتَّمَرَتَيْنِ لَا يُغْنِيَانِ عَنْهُ شَيْئًا)) [22]

"جو آدمی نہ صحیح طریقے سے رکوع کرے اور سجدے میں بھی ٹھونگے ہی مارے اِس کی مثال اس بھوکے شخص کی سی ہے جو ایک یا دو کھجوریں کھاتا ہے اور یہ دو کھجوریں اسے کچھ فائدہ نہیں دیتیں"۔

جو آدمی اطمینان سے نماز ادا نہیں کرتا اس میں خشوع آ ہی نہیں سکتا' اس لئے کہ جلد بازی خشوع کو ختم کر دیتی ہے اور کوّے کی طرح ٹھونگے مارنے سے تو ثواب ختم ہو جاتا ہے۔ (جاری ہے)

حواشی

١) مدارج السالکین '١/٥٢١

٢) تفسیر'ابن کثیر'سورۃ المومنون

٣) مدارج السالکین '١/٥٢٠

٤) تعظیم قدر الصلاۃ للمروزی '١/١٨٨۔ تحقیق د/الفریوائی

٥) مدارج السالکین '١/٥٢١

۶) مسند احمد، ۳/۱۲۸۔ علامہ الالبانی نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو صحیح الجامع الصغیر، ح ۳۱۲۴

۷) المعجم الکبیر للطبرانی کے حوالے سے امام الہیثمی نے مجمع الزوائد ۲/۳۲۶، ح ۲۸۱۳ میں بیان کی ہے اور حسن کہا ہے۔ علامہ الالبانی نے صحیح الترغیب میں اسے صحیح کہا ہے، ح ۵۳۰

۸) مجموع الفتاویٰ ۲۲/۵۵۳۔۵۵۸

۹) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب المحافظۃ علی وقت الصلوات، ح ۴۲۵۔ یہی حدیث متعدد کتب حدیث میں موجود ہے۔

۱۰) صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب الوضوء ثلاثًا ثلاثًا، ح ۱۵۸، و صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب صفۃ الوضوء و کمالہ، ح ۲۲۶۔

۱۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبریل النبی ﷺ، ح ۵۰، و صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الایمان والاسلام والاحسان، ح ۹ و ۱۰

۱۲) مسند احمد ۳/۱۲۸، ۱۹۹، ۲۸۵ و سنن النسائی، کتاب عشرۃ النساء، باب حب النساء، ح ۳۹۴۹، والمستدرک للحاکم ۲/۱۶۰۔ علامہ الالبانی نے حدیث کو صحیح کہا ہے، صحیح الجامع ۳۱۲۴۔

۱۳) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی صلاۃ العتمۃ، ح ۴۹۸۵، ۴۹۸۶

۱۴) مجموع الفتاویٰ ۲۲/۶۰۶۔۶۰۷

۱۵) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب الدعاء عند النداء، ح ۵۸۹

۱۶) صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب الذکر المستحب عقب الوضوء، ح ۲۳۴

۱۷) سنن الترمذی، ابواب الطھارۃ، باب ما یقال بعد الوضوء، ح ۵۵

۱۸) کشف الاستار ۱/۲۴۲ ح ۴۹۶، علامہ الالبانی نے حدیث کو عمدہ قرار دیا ہے السلسلۃ الصحیحۃ ح ۱۲۱۳۔

۱۹) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب افتتاح الصلاۃ، ح ۷۳۰

۲۰) حوالہ سابقہ، باب صلاۃ من لا یقیم صلبہ فی الرکوع والسجود، ح ۸۵۸

۲۱) المستدرک ۱/۲۲۹ و مسند احمد ۵/۳۱۰ و الاحسان ۵/۲۰۹، ح ۱۸۸۸۔ حدیث صحیح ہے۔

۲۲) صحیح ابن خزیمہ ۱/۳۳۲، ح ۶۶۵ و المعجم الکبیر للطبرانی ۴/۱۱۵، ح ۳۸۴۰

علّامہ اقبال اور شعرِ فارسی

ایران کے حال و مستقبل کے آئینہ میں (۲)

بسلسلۂ علامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم (۱۷)

ڈاکٹر ابو معاذ

اس تناظر میں اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کو اپنے عہد کے ایران کے حالات و واقعات اور ملت ایران کی زبوں حالی کی بابت کس طرح کی معلومات حاصل تھیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ آپ نے کبھی بھی اپنی زندگی میں ایران کا سفر نہیں فرمایا۔ آپ کے مشہور ایرانی اسکالر جناب سعید نفیسی کے نام تحریر شدہ خطوط سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں ایران کے سفر کی آرزو ضرور تھی۔ آپ اس سرزمین کے تیزی سے مٹتے ہوئے نقوشِ کہن کا ذاتی طور پر مشاہدہ کرنا چاہتے تھے اور اس قوم کے زعماء سے ملاقات کرنا چاہتے تھے، مگر جو آہنی پردہ انگریزوں کے دورِ حکومت میں دونوں اقوام (ایران اور ہند اسلامی) کے درمیان حائل تھا اس کے باعث آپ اس سفر سے محروم رہے۔ تاہم کسی نہ کسی صورت میں آپ کا رابطہ ایرانیوں سے قائم ضرور تھا اور آپ وہاں کی سیاسی اور فکری تحریکوں کے جوش و خروش سے باخبر تھے۔ اس کا ثبوت ہمیں جاوید نامہ کے ان اشعار سے ملتا ہے جو آپ نے آسمانوں پر ایرانی بادشاہ نادر شاہ افشار سے ایک تصوراتی ملاقات کے ضمن میں کہے ہیں۔ ان اشعار سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال ایران کے حالات و واقعات سے مکمل طور پر واقف تھے، بلکہ آپ فکری اعتبار سے وہیں کے باسی اور مفکر دکھائی دیتے ہیں۔ نادر شاہ افشار آپ کا استقبال کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

خوش بیا اے نکتہ سنجِ خاوری　　اے کہ می زیبد ترا حرفِ دری

(اے مشرق کی سرزمیں کے رازدان خوش آمدید۔ اے کہ تیری زبان پر فارسی گفتگو کس قدر دلکش محسوس ہو رہی ہے۔)

محرمِ رازیم! با ما راز گو آنکہ می دانی ز ایران باز گو!
(ہم ایک دوسرے کے رازدان ہیں' ہمارے ساتھ کوئی راز کی بات کر۔ جو کچھ تمہیں
ایران کے بارے میں معلوم ہے کھل کر بیان کرو۔)

اس کے جواب میں علامہ اقبال "زندہ رود" کے نام سے اپنا پیغام دیتے ہیں۔ زندہ رود دراصل اس دریا کا نام ہے جو ایران کے تاریخی شہر اصفہان کے بیچوں بیچ سے گزرتا ہے اور اس عظیم شہر اور قدیم ایرانی دارالحکومت کی شان دوبالا کرنے کے علاوہ اسے زندگی (کیونکہ خدا نے ہر چیز کو پانی سے زندہ کیا ہے) عطا کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

بعد مدت چشمِ خود بر خود کشاد لیکن اندر حلقۂ دامے فتاد
(ایک طویل عرصہ کے بعد اس نے اپنی نگاہ اپنے آپ پر ڈالی تو ضرور تھی اور خود آگاہی و خود بینی کی لذت پائی تھی' لیکن بہت جلد ایک اور جال کے تانے بانے میں الجھ کر رہ گیا تھا۔)

یہ واقعات دراصل تحریک مشروطیت (پارلیمانی جمہوریت کی تحریک) کے بعد کے اور رضا خاں کے دوبارہ بادشاہت کی بحالی اور مغربی اقتدار کے بزور فروغ سے متعلق ہیں۔ جن کی جانب آپ نے ایک دقیق اور نازک اشارہ فرمایا ہے ؎

کشتۂ نازِ بتانِ شوخ و شنگ خالقِ تہذیب و تقلیدِ فرنگ!
(آج کا ایران مغربی استعمار کے زیر اثر انگریزوں کی اندھی پیروی میں مبتلا ہے اور مغربی تہذیب کی تمام برائیاں اپنے دامن میں سمیٹنے میں کوشاں ہے اور عصر حاضر کے پُر فریب بتوں (بتانِ رنگ و خوں) کی فریب کاری کا شکار ہے۔ افسوس کہ وہ ایران جو کبھی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا آج خود فراموشی کے عالم میں مغرب کی تہذیب پر والہ و شیفتہ ہو رہا ہے۔)

کارِ آں وارفتۂ ملک و نسب ذکرِ شاپور است و تحقیرِ عرب!
(آج کے ایران میں قبل از اسلام کے عہد کی روایات سے وابستگی کے آثار و شواہد مل رہے ہیں اور وہ اپنے ملک کی قدیم تاریخ اور نسل آریائی کی برتری پر فخر کر رہا ہے۔ آج وہ عظیم ساسانی فاتح شاہ پور کا ذکر کر رہا ہے اور عربوں کی تحقیر اور تذلیل میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر رہا۔)

آنحضور ﷺ سے تقریباً تین سو برس پہلے ایرانی بادشاہ شاہ پور ساسانی نے عرب کے علاقوں فتح کرنے کے بعد عربوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیئے تھے۔ عربوں کی قدیم تاریخی کتب میں اسے "شافور ذوالاکتاف" کہا جاتا ہے جس کے معنی ہیں "شاہ پور کندھوں والا"۔ اور یہ اصطلاح اس لئے رائج ہوئی تھی کہ اس نے عرب اسیروں کے کندھوں میں سوراخ کر کے ان میں رسے ڈال کر انہیں انتہائی بیدردی سے ہانکا تھا اور ذلیل و خوار کیا تھا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس موقع پر ایک ضعیف العمر عرب خاتون نے بادشاہ کو خطاب کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اے فاتح بادشاہ اپنی قوت کا اس قدر گھمنڈ مت کر۔ ایک وہ وقت بھی آئے گا جب عرب سے ایک عظیم انسان کا ظہور ہو گا جو ایران کی بادشاہت کا خاتمہ کر دے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تیری قوم کو تیرے ان تمام گناہوں کی مکافات مہنگی پڑ جائے۔ مؤرخین اس بات کو رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے لئے ایک پیشین گوئی بھی سمجھتے ہیں۔ خیر اس شعر میں ایران میں نسلی تفاخر کے احیاء کی تحریک کی جانب اشارہ ہے جو پہلوی دور میں آخر تک زوروں پر رہی۔

روزگارِ اُو تہی از واردات از قبورِ کہنہ می جوید حیات!

(ایران کے موجودہ عہد میں قدامت پرستی، شہنشاہیت کا فروغ اور ماضی کے ساسانی و ہخامنشی عہد کے آثار پر فخر و مباہات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس میں ابھی جدید عہد کے تقاضوں کے مطابق ڈھلنے کی گنجائش کم ہی ہے۔ افسوس اس امر کا ہے کہ وہ اپنی قدیم غیر اسلامی تاریخ پر فخر کرتے ہوئے پرانی قبروں یعنی ماضی کے کھنڈرات سے زندگی تلاش کرنے کی فضول کوشش میں لگا ہے۔)

بعد کے دور میں علامہ اقبال کا خیال سچ ثابت ہوا کیونکہ ۱۹۶۷ء میں منایا جانے والا ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کا جشن ایرانی بادشاہت کے ابدی زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ علامہ اقبال نے بہت عرصہ پہلے اس کی جانب اشارہ فرما دیا تھا ؎

با وطن پیوست و از خود درگذشت دل بہ رستم داد و از حیدر گذشت

(ایرانیوں نے اپنے وطن کو بت بنا کے پوجنا شروع کر دیا ہے اور اپنی مخفی توانائیوں اور خصوصیات سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ انہوں نے رستم جیسے قبل از اسلام کے کرداروں سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا ہے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے اپنا قلبی

تعلق توڑ لیا ہے۔)

پہلوی دور میں کوشش یہ کی جا رہی تھی کہ ماقبل اسلام کے عہد کے ہیرو دوبارہ قابلِ تکریم قرار دے جائیں اور آہستہ آہستہ مذہب سے دُوری اختیار کر لی جائے۔ علامہ اقبال کے ہاں ایرانی افراد دنیا کے ذہین ترین اور قابل ترین لوگ تھے جنہوں نے قبول اسلام کے بعد اپنی خوبیوں اور جوہر ذاتی کا لوہا منوایا تھا۔ وہ اپنے وطن پر فخر کرنے کی بجائے اگر اسلام کے سپاہی بن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیروی کو ایک بار پھر سے اپنا شعار بنا لیں تو وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت دیرینہ کو بحال کر سکتے ہیں ؎

نقشِ باطل می پذیرد از فرنگ سرگزشتِ خود بگیرد از فرنگ!

(آج کا ایران اہل مغرب کے غلط نظریات کو اپنا رہا ہے اور خود کو مغربی رنگ میں رنگنے میں کوشاں نظر آ رہا ہے۔)

یہ سب کچھ واضح انداز میں بیان فرمانے کے بعد علامہ اقبال ایرانیوں کو ان کی اصلیت یاد دلاتے ہیں۔ ایک وہ وقت تھا جب ساسانی عہد میں ایران کی بادشاہت شکست و ریخت کے عمل سے دوچار ہو چکی تھی اور اس کی صدیوں کی عظمت کی کشتی ڈگمگاتی ہوئی ہچکولے کھا رہی تھی تو مسلمانوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں عرب سے اُٹھ کر اس کے عروقِ مُردہ میں جان دوڑا دی تھی اور اسلام قبول کرنے کے بعد ایک بار پھر ایرانیوں کی جملہ خوبیاں دنیا میں نئے پہلوؤں کے ساتھ روشناس ہوئی تھیں۔ اگر اسلام کی قوت اس وقت ایرانیوں کی خوبیوں کا سرچشمہ نہ بنتی تو ممکن تھا کہ سلطنتِ روما (Roman Empire) کی طرح ایران کا وجود بھی مکمل طور پر مٹ جاتا۔ آپ فرماتے ہیں ؎

پیرِ ما ایران زمانِ یزدجرد چہرۂ او بے فروغ از خونِ سرد!

(یزدگرد سوم ساسانی بادشاہ کی نوبت آتے آتے ایران کی قدیم بادشاہت پر بڑھاپا طاری ہو چکا تھا۔ امتدادِ زمانہ کے باعث اس کی رگوں میں خون جم چکا تھا اور اس کے چہرے پر کوئی سرخی اور چمک باقی نہیں رہی تھی۔)

یزدگرد سوم وہ بادشاہ تھا جس کی فوجوں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مسلمانو

کی کئی فیصلہ کن جنگیں ہوئیں اور بالآخر مسلمانوں نے تمام ایرانی مقبوضات پر قبضہ کرلیا اور یہ بادشاہ قبل از اسلام ایران کا آخری تاجدار ثابت ہوا۔

دین و آئین و نظامِ اُو کہن شید و تارِ صبح و شامِ اُو کہن!

(اس کا دین زرتشت' اس کی قدیم شہنشاہیت کا استبدادی آئین اور اس کا ظالمانہ نظام حکومت سب کے سب بوسیدہ ہو چکے تھے' حتیٰ کہ اس کی صبح کا سورج اور رات کی تاریکی بھی پرانی ہو چکی تھی۔)

موجِ مے در شیشۂ تاکش نبود یک شرر در تودۂ خاکش نبود!

(اس کے انگور کی بیل کی رگوں میں شراب کی کوئی لہر باقی نہیں تھی اور ایران ایک مٹی کا تودہ بن چکا تھا' جس میں ایک چنگاری بھی باقی نہیں بچی تھی۔)

اس سے مُراد یہ ہے کہ اس کا قدیم جوش و جذبہ اور حرارت ختم ہو چکی تھی۔

تا ز صحرائے رسیدش محشرے آن کہ داد اُو را حیاتِ دیگرے!

(حتیٰ کہ صحرائے عرب سے ایک محشر برپا ہوا' جو ایران پر قیامت بن کر نازل ہوا اور اس قیامت کے باعث ایران کو ایک نئی زندگی مل گئی۔)

جس طرح مسلمانوں کا ایمان ہے کہ قیامت کے باعث مُردے اپنی قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے اسی طرح ایرانی قوم بھی اپنی موت کے بعد زندہ ہو گی۔

ایں چنیں حشر از عنایاتِ خداست پارس باقی! رومۃ الکبریٰ کجاست؟

(ایسی قیامت بھی دراصل اللہ کی عنایت ہی ہوتی ہے کیونکہ آج رومۃ الکبریٰ کی بادشاہت کے آثار تو مٹ چکے ہیں لیکن سلطنت فارس کی حدود اور سرزمین اب بھی موجود ہے۔)

آں کہ رفت از پیکرِ اُو جانِ پاک بے قیامت بر نمی آید زخاک!

(ایک بار اگر کسی کے جسم سے رُوح نکل آئے تو پھر اس کا جسم قیامت کے بغیر تو مٹی سے دوبارہ نہیں اُٹھ سکتا۔)

مردِ صحرائی بہ ایراں جاں دمید باز سوئے ریگزارِ خود رمید!

(ان صحرائی مجاہدین نے ایران میں پھر سے زندگی کی رُوح پھونک دی اور اپنا مشن مکمل کرنے کے بعد دوبارہ اپنے صحرائے حجاز کو پلٹ گئے۔)

کہنہ را از لوحِ ما بسترد و رفت برگ و سازِ عصرِ نو آورد و رفت!

(تمام فرسودہ نقوش اور روایات کو وہ صحرائی مجاہد ہماری لوح سے مٹا کے چلے گئے اور ایک نئے عظیم دور کا آغاز کر کے چلے گئے۔)

یہاں علامہ اقبال نے خود کو ایران کے ساتھ شامل کرتے ہوئے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ آپ اکثر رُوحانی اور لسانی اعتبار سے خود کو ایرانی ہی تصور فرماتے تھے (جیسے آپ نے اردو میں بھی کہا تھا ع "تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے"۔

دراصل آپ کی نظر میں تمام قدیم ایرانی مقبوضات (قبل از اسلام) کی اقوام ایک ہی مزاج اور ایک ہی سوچ کی حامل ہیں۔

آہ احسانِ عرب نشناختند از تشِ افرنگیاں بگداختند!

(آہ ایرانیوں نے عربوں کا احسان بھلا دیا اور افرنگیوں کی آگ کی گرمی میں پگھل کر اپنا وجود کھو بیٹھے، کیونکہ ایک بار پگھل کر کوئی چیز کسی بھی نئے سانچے میں ڈھل سکتی ہے۔)

ان اشعار سے یہی واضح ہوتا ہے کہ آپ کو ایران کے مایوس کن حالات و واقعات پر نہ صرف گہرا دلی دکھ تھا بلکہ آپ وہاں سے مغربی استعمار کے آثار کا مکمل خاتمہ کی خواہش کرتے ہوئے اس قوم کی اسلام کی جانب رجعت کی آرزو اپنے دل میں بسائے ہوئے تھے۔ آپ نے جب ایرانیوں کے ساتھ "ہم" کا صیغہ استعمال کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس احیائے اسلام کے نئے دور میں اپنی قوم کو بھی ایرانی ملت کے ساتھ بطور شریک و سہیم تصور فرما رہے تھے۔ جب مغربی تہذیب پر مبنی علم ایران و ہند کو اس کے اصل جواہر سے محروم کر کے اہل عجم کو مخمور کر رہا تھا اور جہد و عمل کی سکت چھن رہی تھی تو آپ ایک بار پھر ان اقوام کو خوابِ گراں سے بیداری کی تلقین فرما رہے تھے۔ جہاں آپ ایران کے عظیم مفسر قرآن حضرت امام فخرالدین رازیؒ کی تفسیر اور استدلال و فلسفہ کا ذکر فرماتے ہیں وہاں ساتھ ہی جوش و ولولہ کے حصول کیلئے حضرت حیدر کرار رضی اللہ عنہ کا ذکر بھی فرماتے ہیں جن کی تعظیم اہل ایران کے دل و جان میں موجود رہی ہے ؎

من آن علمِ فراست با پرِ کاہے نمی گیرم کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را!

بہر نرخے کہ این کالا بگیری سود مند افتد بزورِ بازوے حیدر بدہ ادراکِ رازی را

(میری نظر میں اس علم و فراست کی قیمت گھاس کے تنکے کے برابر بھی نہیں ہے جو

مردانِ غازی کو تلوار اور ڈھال سے محروم کر دے۔ تمہیں جس قیمت پر بھی یہ مال ملے اسے خرید لو جس میں رازی کا تدبر حضرت علیؓ کے قوتِ بازو پر ڈال دیا گیا ہے۔)

اب آپ اصل ایران کو قدیم بادشاہت کے بچے کھچے آثار سے بیزاری کا درس دینے لگے اور آپ کی نظر میں ماضی کے مزاروں میں چونکہ زندگی کی رمق باقی نہیں رہی تھی اس لئے لازمی تھا کہ انقلاب کے لئے جدوجہد کا آغاز کر دیا جائے۔

مدّتے در آتشِ نمرود می سوزد خلیلؑ   تا تہی گردد حریمش از خداوندانِ پیر
دورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز   نعمتِ گم گشتہ خود را ز خسرو باز گیر

(ایک طویل عرصہ تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود کی جلائی ہوئی آگ میں جلنا پڑتا ہے پھر کہیں اس کا حریم دل ماضی کے خداؤں اور بتوں سے پاک ہوتا ہے۔ اے خسروِ پرویز کی شہنشاہیت پر مٹنے والے بے خبر انسان! اپنی طویل نیند سے بیدار ہو جا کیونکہ اب بادشاہت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اپنی آزادی اور مذہبی حمیت سمیت تمام نعمتوں کو، جو شہنشاہوں نے تم سے سلب کر رکھیں، اب اٹھ کے واپس لے لو۔)

ایک بار پھر علامہ اقبال کو ایران کی خوابِ گراں میں سوئی ہوئی قوم پر ترس آتا تھا جو کبھی کبھی خواب گراں سے اپنی آنکھ کھولتی تھی اور پھر کسی اور فلاکت و بربادی کے چکر میں پڑ جاتی تھی۔ آپ کی نگاہ میں نہ صرف شاہی نظام کے استبداد کا مسئلہ تھا بلکہ علماء کے ایک منظم گروہ کی حمایت بھی شاہی نظام ہی کو حاصل تھی۔ آپ نے اس پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا ؎

آسیا آن مرز و بومِ آفتاب   غیر بین از خویشتن اندر حجاب
صیدِ ملّایان و نخچیرِ ملوک   آہوے اندیشۂ او لنگ و لوک

(ایشیاء جو سورج کی سرزمین ہے وہ اب غیروں کی ہمدردی کی امید لگائے بیٹھی ہے اور اپنے ملی اور فکری تشخص سے محروم ہے۔ یہ آج کل ملاؤں کا شکار ہے اور بادشاہوں کے پھیلائے ہوئے جال میں بری طرح جکڑی ہوئی ہے اور اس کی سوچوں کا آزاد ہرن اب لنگڑا لولا ہو چکا ہے۔)

اب یہاں یہ بات بہت اہم ہے کہ ایشیا سے مراد علامہ اقبال کے ہاں اسلامی ایشیاء ہے کیونکہ یہاں پر ملاؤں کا ذکر ہے اور اس برّاعظم میں پھر ملاؤں کا منظم نظام ہمیں صرف

ایران ہی میں نظر آتا تھا اور بادشاہت بھی وہیں تھی۔ ایران ہی کو مرز و بوم آفتاب کہا جاتا رہا ہے اور رضا شاہ پہلوی کے دور تک ایران کے جھنڈے پر آفتاب کی علامت بنی ہوئی تھی۔ اس طرح ایشیاء کے براعظم میں بھی جس قوم سے خطاب کیا گیا ہے وہ بھی ایرانی قوم ہی ہے۔ یہ حقیقت مندرجہ ذیل اشعار میں بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

بگذر از کاؤس و کے اے زندہ مَرد   طوفِ خود کن گردِ ایوانے مگرد
از مقامِ خویش دور افتادہ ای   کر کسی کم کن کہ شاہین زادہ ای

(اے زندہ انسان ایران کے اساطیری بادشاہوں کیکاؤس اور کیقباد کے چکروں سے باہر نکل آ۔ شاہی محلات کے ارد گرد طواف کرنے کی بجائے تو اپنی ذات کا ادراک کر۔ تو اپنے اصلی مقام سے کہیں بہت دور گرا پڑا ہے۔ تو شاہینوں کی اولاد ہے' تو نے پھر گدھوں کی فطرت کیوں اپنا رکھی ہے؟)

یہاں پر کیکاؤس اور کیقباد کا تذکرہ اور شاہی محلات کا طواف اسی جانب اشارہ ہے۔ پھر آپ نے شاہینی اوصاف اپنانے اور اپنی خودی کو پہچاننے کی جانب زور دیا ہے۔ وہ جوہر ذاتی جو ایران و ہند کے جوانوں میں تھے وہ کھو چکے تھے اور اہل ایران تو مکمل مایوسی اور ذہنی جمود کا شکار تھے۔ وہ خود کو فراموش کر چکے تھے اور مغربی تعلیم اور تہذیب سے دل و نظر کی روشنیاں تلاش کرنے میں منہمک تھے۔ آپ نے "گلشن رازِ جدید" میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منصور حلاج کی زبانی کہلوایا ہے کہ

ہر کجا پیدا و ناپیدا خودی   بر نمی تابد نگاہِ ما خودی
نار ہا پوشیدہ اندر نورِ اوست   جلوہ ہاے کائنات از طورِ اوست
ہند و ہم ایراں زنورش محرم است   آنکہ نارش ہم شناسد آن کم است

(ہر جگہ خودی ظاہر بھی ہے اور غائب بھی ہے' لیکن ہماری نظروں سے وہ اوجھل ہی رہتی ہے۔ اس کی روشنی میں حرارت یعنی آگ بھی ہے اور کائنات کے تمام تر جلووں کا مرکز اسی کا کوہ طور ہے۔ ہندوستان اور ایران کو اس کی روشنی کا ادراک تو ہے مگر اس کی گرمی اور حرارت سے مستفید ہونے والے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔)

اب کم از کم ایران و ہند میں آپ کو خودی کے ایک پہلو سے باخبر کچھ نہ کچھ لوگ تو مل گئے

تھے۔ اب خودی کی آگ ان کے دلوں میں روشن کرنا مقصود تھی۔ اسی طرح آپ نے پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ ایرانی قوم میں جو فقر و درویشی اور استغناء کے عناصر تھے وہ امتدادِ زمانہ کے باعث باقی نہیں بچے۔ اس طرح کسی بھی ملک کی سرزمین کے وجود کی اُس وقت تک کوئی اہمیت نہیں جب تک اس کے باسیوں میں بھی اس کی قوم سے وابستہ اصلی خوبیاں اور خصائل عود نہ کر آئیں۔

عشق را آئینِ سلمانی نماند خاکِ ایران ماند و ایرانی نماند!
سوز و سازِ زندگی رفت از کلش آن کہن آتش فسرد اندر دلش!

(عشق میں حضرت سلمان فارسیؓ کے درویشانہ خصائل باقی نہیں رہے۔ ایران کی سرزمین تو اپنی جگہ قائم و دائم رہ گئی ہے مگر اس میں بسنے والے ایرانی لوگ باقی نہیں رہے۔ ایرانیوں کے ضمیر سے زندگی کا سوز و ساز ختم ہو چکا ہے۔ ان کی قدیم ایرانی آگ ان کے دلوں سے بجھ چکی ہے۔)

یہ آگ کیا تھی؟ یہ آگ ہرچند کہ روایتی طور پر قدیم قبل از اسلام ایران کی آتش مقدس ہی سمجھی جاتی رہی ہے مگر اقبال کی نظر میں یہ ایرانیوں کا مخفی جذبہ 'حرارتِ ایقانی' حرکیت اور جوش و جنون کا جذبہ تھا جس نے اسلام کے لبادے میں آنے کے بعد عظمتوں کے آثار اور مظاہر جنم دیئے تھے۔ اقبال اسی آگ کو اپنے سینے میں روشن سمجھتے تھے اور اسی آگ کے گرد ایرانیوں کو جمع ہونے کا درس دیتے تھے' جیسے کہ آپ نے اسرارِ خودی میں فرمایا تھا ؎

انتظارِ صبحِ خیزاں می کشم اے خوشا زرتشتیانِ آتشم

(میں اذان حق دینے کے بعد صبح صبح جلد بیدار ہونے والے لوگوں کا منتظر ہوں۔ میرے سینے میں روشن آگ کے زرتشتی یعنی پجاری کس قدر عظیم ہوں گے۔)

ہم یہاں تلمیحات اور شاعرانہ موشگافیوں میں نہیں الجھنا چاہتے ورنہ اکثر فارسی شعراء نے آگ کا ذکر پورے طمطراق سے کیا ہے اور نظیری نیشاپوری کے بقول انسان کے دل میں خامی (یعنی کچا ہونے) کی بو آتی ہے اور اس کو پکنے کے لئے آگ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح نادر شاہ کے جواب میں علامہ کے اشعار میں ہم نے ایران کے مٹی کے تودہ میں چنگاری نہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔

اب مزید تفصیل میں جانے کی بجائے علامہ اقبال کی اس تاریخی غزل کی جانب آتے ہیں جو ایرانی انقلاب سے قبل ایران میں بہت مقبول ہوئی تھی اور اس میں آپ نے ایرانی قوم کی نوجوان نسل کو خطاب کرتے ہوئے نہ صرف اپنے ذوق وشوق کی واردات کی خبر دی ہے بلکہ اسلامی انقلاب کے خدوخال واضح فرماتے ہوئے آپ نے ممکنہ واقعات کی اس انداز سے پیشین گوئی فرمائی ہے گویا آپ مستقبل کے واقعات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ فرما رہے تھے' کیونکہ یہ تمام پیشین گوئیاں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئیں۔ یہ غزل زبورِ عجم میں موجود ہے اور آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے ؎

چوں چراغِ لالہ سوزم درخیابانِ شما　　اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما!

(اے ایران کے جوانو! میں آپ کے ہمراہ آپ سے یکجا ہو کر آپ ہی کے باغ کی کیاری میں سرخ لالے کے پھول کا دیا بن کر جل رہا ہوں۔)

غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ اَم　　تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما!

(میری بے چین سوچیں زندگی کے ضمیر میں غوطوں پر غوطے لگاتی رہی ہیں اور بڑی مشکل سے میری رسائی آپ کے ان افکار تک ہوئی ہے جو سب کی نگاہوں سے ابھی تک مکمل طور پر اوجھل رہے ہیں۔)

مہر و مہ دیدم نگاہم بر ترازِ پرویں گذشت　　ریختم طرحِ حرم در کافرستانِ شما!

(میری بلند نگاہیں چاند اور سورج کی فضاؤں سے گزرتے ہوئے ستاروں کے جھرمٹ پروین سے بھی کہیں بلندی پر جا پہنچی ہیں اور میں نے چپکے سے تمہارے کافرستان میں حرم کی بنیاد رکھ دی ہے۔)

تا سنانش تیز تر گردد فرو پیچید مش　　شعلہ ٔ آشفتہ بود اندر بیابانِ شما

(تمہارے بیابان میں ایک شعلہ سا جل رہا تھا اسی کی مشعل یا نیزے کو میں نے پکڑ کر اور تیزی سے گھما گھما کر اس کا رخ اتنی سرعت سے بدلا ہے کہ وہ تیز سے تیز ہو کر بھڑک سکے اور تمہارے خاموش شعلوں کی روشنی اور حرارت سب پہ آشکار ہو جائے۔)

فکر رنگینم کند نذرِ تہی دستانِ شرق　　پارۂ لعلی کہ دارم از بدخشانِ شما

(آپ کے بدخشان سے میرے ہاتھ جو لعل کا ٹکڑا لگا تھا اسی کو میری رنگین سوچیں مشرق میں بسنے والے خالی ہاتھ بے مایہ لوگوں میں حیرت کی صورت میں بانٹ

رہی ہیں)

می رسد مردے کہ زنجیرِ غلامان بشکند دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما

(میں نے تمہارے قید خانے کی دراڑ سے اس آدمی کا چہرہ بھی دیکھ لیا ہے جو اچانک آزاد فضاؤں میں آکر تمام غلاموں کی زنجیروں کو توڑ کر رکھ دے گا۔)

حلقہ گرد من زنید ای پیکرانِ آب و گِل آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما!

(اے کچی مٹی کے بنے ہوئے مجسموں جیسے بے جان جسمو! میرے اردگرد جمع ہو جاؤ اور میری قلبی حرارت کے باعث پک جاؤ کیونکہ میرے سینے میں تمہارے ہی اسلاف کی آگ روشن ہے۔)

اب اس قدر واضح الفاظ میں جہد و عمل کا پیغام اور روشن مستقبل کی خوشخبری دیتے ہوئے آپ نے شہنشاہیت کے اس مذموم پراپیگنڈے کا توڑ پیش کیا کہ شہنشاہیت کے مٹ جانے سے ایران اور ایرانی قوم ختم ہو جائے گی۔ آپ نے فرمایا ؎

سکندر رفت و شمشیر و علم رفت خراجِ شہر و گنج کان و یم رفت

امم را از شہان پائندہ تر دان نمی بینی کہ ایران ماند و جم رفت

(سکندر کا زمانہ بھی بیت گیا ہے اور جدید اسلحے کی ایجاد اور جنگی فنون میں ترقی کے باعث شمشیر اور علم بھی اپنی اہمیت و افادیت کھو بیٹھے ہیں۔ مفتوحہ شہروں سے خراج وصول کرنے کا عہد بھی گزر گیا ہے اور کانوں اور سمندروں سے نکلنے والے خزانوں کے نشانات بھی مٹ گئے ہیں۔ قومیں بادشاہوں کی نسبت زیادہ طویل عرصہ تک قائم و دائم رہتی ہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جمشید جیسے بادشاہ کے خاتمے کے باوجود بھی ایران اپنی جگہ پر قائم و دائم رہ گیا ہے۔ اس لئے بادشاہت کے خاتمے سے اقوام مٹ نہیں جایا کرتیں۔)

ہر چند کہ آپ کے اپنے زمانے میں آپ کے اشعار و افکار کو وہ فروغ حاصل نہیں ہو رہا تھا جس کا مستحق آپ کا کلام تھا۔ برصغیر کے لوگ اکثر فارسی سے نابلد ہونے کی وجہ سے (ماسوائے چند لوگوں کے) آپ کے افکار کو سمجھنے سے ویسے ہی قاصر تھے اور ان دنوں روابط کے فقدان کے باعث ایران تک آپ کے کلام کو پہنچنے میں تاخیر ہو رہی تھی اور بہت کم لوگوں تک آپ کا کلام پہنچ پایا تھا اور وہ بھی تا حال رائج الوقت محاورے کے فرق

کے باعث اس کی تہہ تک پہنچنے میں کسی حد تک دشواری کا احساس کر رہے تھے۔ آپ نے اس بارے میں فرمایا ؎

مسنج معنیٔ من در عیارِ ہند و عجم کہ اصل ایں گہر از گریہ ہائے نیم شبی است

(میرے افکار کو ہندوستان اور ایران میں مروج پیمانوں سے مت ناپو اور ان کی کسوٹی پر مت پرکھو کیونکہ اس ہیرے کا سرچشمہ میری آدھی رات کی عبادات اور گڑگڑا کر مانگی ہوئی دعائیں ہیں۔)

اس کے باوجود آپ اپنے نغمات اور افکار عام کرنے کی جدّوجہد جاری رکھے ہوئے تھے اور فرما رہے تھے ؎

ز جانِ بے قرار آتش کشادم دلے در سینۂ مشرق نہادم

گلِ اُو شعلہ زار از نالۂ من چو برق اندر نہادِ اُو فتادم

(میں نے اپنی بے قرار جان سے آگ روشن کر کے اسی آگ کا دل بنا کر مشرق کے سینے میں رکھ دیا۔ اب وہاں کی مٹی میرے نالہ کے باعث شعلوں کو جنم دے رہی ہے اور اس کی فطرت میں آسمانی بجلی بن کے میں گر پڑا ہوں۔)

یہ سب کچھ مستقبل کی طرف اشارے تھے۔ اسی لئے آپ فرما رہے ہیں ؎

پس از من شعرِ من خوانند و دریا بندومی گویند

جہانے را دگر گوں کرد یک مردِ خود آگاہی

(میرے بعد لوگ میرے اشعار پڑھیں گے اور جب ان پر ان کے معانی واضح ہوں گے تو یہ کہا کریں گے کہ ایک خود شناس انسان نے دنیا کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔)

اب آپ کو ایک انقلاب کا عہد نظر آ رہا تھا اور قدیم نظام کے تار و پود بکھرتے ہوئے نظر آ رہے تھے ان کی جو انان عجم سے جو امیدیں وابستہ تھیں ان کے بارے میں ہر چند زمانہ بے خبر تھا مگر ہم علامہ اقبال کے تصورات کی ایک جھلک انہی کی زبان سے پیش کرتے ہیں تاکہ جو کچھ آپ کی دور بین نگاہوں کے سامنے تھا اس کی ایک تصویر کھنچ سکے اور مستقبل کے آئینے میں اس کا ادراک کیا جا سکے۔

من درین خاکِ کہن گوہرِ جان می بینم چشمِ ہر ذرہ چو انجم نگران می بینم

(مجھے اس قدیم سرزمین میں جان کا گرانقدر موتی نظر آ رہا ہے اور اس کی مٹی کے ہر ایک ذرے کی آنکھ ستاروں کی طرح بے چین اور دیدہ ور نظر آ رہی ہے۔)

دانہ ای را کہ بہ آغوشِ زمین است ہنوز شاخ در شاخ و برو مند و جوان می بینم

(وہ دانہ جو زمین کی آغوش میں ابھی پڑا ہوا ہے مجھے اس دانے سے پیدا ہونے والا درخت نظر آ رہا ہے جس کا پھیلاؤ اور شاخیں میری نظر میں ایک سایہ دار درخت کا منظر پیش کر رہی ہیں۔)

کوہ را مثلِ پرِ کاہِ سبک می یابم پرِ کاہی صفتِ کوہِ گران می بینم

(آج جو پہاڑوں کی طرح عظیم اور بوجھل نظر آنے والے اجسام ہیں وہ مجھے گھاس کے تنکے کی طرح ہلکے نظر آ رہے ہیں اور مستقبل کی آنکھ سے گھاس کے تنکوں کو میں پہاڑوں کی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔)

اس سے مراد یہ ہے کہ آج کے مضبوط اور بااثر لوگ کل خوار و رسوا ہونے والے ہیں اور کمزور لوگوں کو اختیار و اقتدار ملنے والا ہے۔

انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیرِ افلاک بینم و ہیچ ندانم کہ چسان می بینم

(ایک ایسا انقلاب جو آسمانوں کی وسعتوں میں بھی سما نہیں رہا سے میں دیکھ بھی رہا ہوں اور مجھے یہ بھی سجھائی نہیں دے رہا کہ کیسے دیکھ رہا ہوں۔)

خرم آن کس کہ دریں گرد سوارے بیند جوہر نغمہ ز لرزیدن تارے بیند

(آپ اس شخص کی خوشی کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو اس گرد و غبار ایام میں ایک سوار کے آثار و نقوش واضح طور پر دیکھ رہا ہو اور آلہ موسیقی کے تار کے ہلنے سے ہی اس میں پوشیدہ نغمات کا جوہر محسوس کرنے لگ جائے۔)

اس انقلاب کے نتیجہ میں جو کچھ سامنے آنے والا تھا وہ کچھ یوں تھا' جسے علامہ اقبال نے ایک اور مقام پر زبورِ عجم میں بیان کیا ہے ؎

سطوت از کوہ ستانند و بکاہے بخشند کلۂ جم بہ گدائے سرِ راہے بخشند

(پہاڑ سے اس کی عظمت و ہیبت چھین کر ایک گھاس کے تنکے کو عطا کر دی جائے گی اور جمشید بادشاہ کا تاج ایک سر راہ بیٹھے ہوئے فقیر کی نذر ہو جائے گا۔)

گاہ شاہی بہ جگر گوشۂ سلطان ندہند گاہ باشد کہ بزندانیٔ چاہے بخشند

(کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاہ کا ولی عہد تخت و تاج سے محروم رہ جائے اور اقتدار اس

شخص کو مل جائے جسے کنویں میں پھینک کر قید رکھا گیا ہو۔)

اسی اسلوب میں ایک اور مقام پر آپ نے ماضی سے استناد فرماتے ہوئے یہ یاد دلایا کہ پہلے بھی ایسے کئی ادوار آئے جب عظیم بادشاہ اُٹھے' آناً فاناً دنیا پر چھا گئے اور پھر چند ہی برسوں میں ان کا نشان تک باقی نہ رہا۔

چوں رہ گزر باد افتاد رفت اِسکندر و دارا و قباد و خسرو

(اس گھاس کے تنکے کی طرح جو تیز ہوا کے جھونکوں کے مدمقابل گرا پڑا ہو' اسکندر اعظم مقدونی' داریوش ہخامنشی یا دارا' قباد ساسانی اور خسرو نوشیروان یا خسرو پرویز جیسے شہنشاہ اپنا نام و نشان کھو بیٹھے۔)

علامہ اقبال کو دکھ اس امر کا تھا کہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں بھی لوگ غلامانہ ذہنیت اور بادشاہوں کے استبدادی نظام کے جال سے باہر نہیں نکل سکے تھے۔

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد

(انسان نے بصیرت کے فقدان کے باعث انسانوں کی غلامی اور پرستش کو اپنا شعار بنا لیا۔ اپنے جوہر ذاتی اور آزادی کے قیمتی ہیرے کو قباد ساسانی اور جمشید جیسے شہنشاہوں کے حضور نذرانے کی صورت میں پیش کر دیا۔)

یعنی از خوے غلامی زسگان خوار تراست من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سرخم کرد

(درحقیقت غلامی سے خوگری کے باعث آج کا انسان کتوں سے بھی بدتر ہے کیونکہ آج تک میں نے کسی کتے کو دوسرے کتے کے سامنے سر جھکاتے ہوئے نہیں دیکھا۔)

اس تمام کشمکش میں آپ خود فارسی گو خطوں یعنی ایران' افغانستان اور سمرقند و بخارا کی سرزمین کی جانب دیکھ رہے تھے آپ کو مستقبل کی امیدیں اسی خطے سے تھیں۔

اگرچہ زادۂ ہندم فروغ چشمِ من است زخاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز

(اگرچہ میں ہندوستان میں پیدا ہوا ہوں مگر میری آنکھوں کی روشنی بخارا' کابل اور تبریز کی پاک مٹی کی وجہ سے ہے۔)

آپ کو اہل تبریز (یعنی ایرانیوں) سے خاص قسم کی امیدیں وابستہ تھیں۔ آپ یہاں کے لوگوں کی مخفی توانائیوں اور خصائل کے معترف تھے۔ آپ نے کس خوبصورت انداز میں اپنے اردو اشعار میں فرمایا ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے　　وہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی
نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے　　ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

شروع شروع میں آپ کو خاک عرب اور اہل عرب سے بھی توقعات وابستہ رہی ہیں۔

عرب از سرشکِ خونم ہمہ لالہ زار بادا　　عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا

(میرے خون کے آنسوؤں کے باعث سرزمین عرب لالہ زار بن جائے اور وہ عجم جس کی خوشبو اُڑ چکی ہے اس کے لئے میری سانسیں بہار کے جھونکوں میں بدل جائیں۔)

لیکن مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ آپ کی توقعات عجم سے وابستہ ہوتی چلی گئیں اور آپ اہل عرب سے مایوس ہوتے چلے گئے۔

نوائے من بہ عجم آتشِ کہن برا فروخت　　عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

(میری نواؤں کے باعث ایران کی قدیم آگ دوبارہ روشن ہو کر وہاں کے لوگوں کی روح کو گرما رہی ہے مگر عرب میرے شوق کے نغموں سے ابھی تک بے خبر ہے۔)

پھر آپ نے عجم کو اپنے اشعار و افکار (چشم حال) سے جس طرح متاثر پایا، اس کا اظہار یوں فرمایا ؎

عجم از نغمۂ شوقم آتش بجان است　　صدائے من درائے کاروان است

(میرے شوق کے نغموں کے باعث عجم کی جان میں آگ لگ گئی ہے اور میری آواز قافلے کے آگے آگے بجنے والی گھنٹی یعنی درا کا کام کر رہی ہے۔)

اور

حدی را تیز تر خوانم چو عرفی　　کہ رہ خوابیدہ و محمل گران است

(میں عرفی شیرازی کی طرح حدی یعنی قافلے کے ساتھ ساتھ گائے جانے والے مخصوص گیت کو تیز تیز انداز میں گا رہا ہوں کیونکہ راستے بھر میں لوگ سوئے ہوئے ہیں اور محمل کافی بھاری محسوس ہو رہی ہے۔)

آپ کی صدائیں جب عجم میں روح پھونک رہی تھیں تو آپ کو اپنی محنت بار آور ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھی اور آپ ایک صبح تاباں کا انتظار فرما رہے تھے۔ آپ نے کس خوش اسلوبی سے فرمایا ؎

عجم از نغمہ ہائے من جواں شد　　ز سودایم متاعِ او گراں شد

ہجومے بود رہ گم کردہ در دشت ز آوازِ درایم کارواں شد
(بالآخر ایران میرے مسلسل گائے جانے والے نغمات کی بدولت جوان ہو گیا اور اس میں زندگی کا جوش واپس لوٹ آیا۔ یہ میرا جوش جنون تھا جس نے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا۔ ایران کیا تھا' کسی صحرا میں بھٹکے ہوئے لوگوں کا قافلہ تھا' جو میری بانگ درا یعنی قافلے کو مجتمع کرنے والی گھنٹی کی آواز سے ایک کارواں بن گیا۔)

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا
(اس کاروان کے راستے میں مشکلات تھیں اور پریشانیاں تھیں۔ نہ کوئی منزل متعین تھی اور نہ راستے کے نقوش واضح تھے۔ علامہ اقبال کی آرزو تھی کہ وہ ایک منزل پا لے۔)

شبِ تاریک و راہِ پیچ پیچ و بے یقین راہی دلیلِ کارواں را مشکل اندر مشکل افتاد است
(رات اندھیری ہے راستہ بل کھاتا ہوا اور پیچا پیچ ہے مسافر بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہیں ایسے کارواں کی منزل مقصود کی جانب سفر میں مشکلات ہی مشکلات درپیش ہیں۔)

ان تمام واقعات اور حالات کے ادراک کے باوجود آپ کبھی محبت سے اور کبھی تشویق سے کارواں کو آگے بڑھاتے ہوئے کہہ رہے تھے ؎

زندہ کن باز آن محبت را کہ از نیروے او بوریاے رہ نشینے درفتد با تخت کے
(ایسی محبت کو زندہ کر دو یعنی وطن اور دین کی محبت میں سرشار ہو جاؤ اور موت کی پروا نہ کرو۔ آپ کے اس جذبہ کے باعث ایک رہ نشین درویش کا بوریا کیقباد کے تخت سے ٹکرا جائے گا۔)

آپ کی نگاہوں میں جو قوم مشرق کے دینی اور فکری احیاء کے باعث مستقبل کی موہوم تصویر تھی' وہ شاید کچھ اس طرح کی تھی ؎

دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب ممکن ہے کہ اِس دَور میں تعبیر بدل جائے
تہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ دوسرے شعر کا ترجمہ جناب عرفانی مرحوم نے فارسی میں یوں کیا ؎

گر شود تہراں جنیوا از براے اہلِ شرق بو کہ تغییرے کند تقدیر شومِ روزگار

یہ ترجمہ ایران میں اس قدر مقبول ہوا کہ اکثر لوگوں نے اسے شعری ترجمہ کی بجائے حضرت علامہ اقبال کا اصلی شعر ہی سمجھ لیا۔

یہاں ہم نے علامہ اقبال کے بیان کردہ دیگر موضوعات سے پہلو تہی کی ہے جن کا فکری اور معنوی احاطہ آپ نے اپنے اشعار میں فرمایا ہے اور جس سے ایرانی قوم متاثر ہوئی ہے یا جن کا غلغلہ آج دوسرے فارسی گو علاقوں میں سنا جا رہا ہے۔ یہاں صرف انقلابِ ایران کے بارے میں بیان کردہ اشعار اور وہ بھی دانستہ طور پر فارسی اشعار ترجمے کے ہمراہ پیش کئے گئے ہیں۔ یہ تمام اشعار و افکار آہستہ آہستہ ایران میں ترویج پاتے چلے گئے اور ان کے باعث دیگر ایرانی شعراء و متکلمین نے آپ کی پیروی میں آپ ہی کے انداز و اسلوب میں شعر کہنا شروع کر دیئے اور مضامین لکھے۔ اگلے صفحات میں ہم بہت مختصر انداز میں چیدہ چیدہ ان شعراء اور مفکرین کے بارے میں کچھ لکھنے کی کوشش کریں گے جنہوں نے ایران میں علامہ اقبال کے کلام کی اشاعت اور آپ کے افکار کی تبلیغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں جناب محیط طباطبائی، ملک الشعراء محمد تقی بہار، جناب صادق سرمد، رضازادہ شفق، جناب سعید نفیسی اور جناب علی شریعتی کے علاوہ ممتاز عالم دین علامہ آیت اللہ فیض، مجتبیٰ مینوی اور احمد سروش کی علامہ اقبال کے کلام کی ترویج کے لئے کاوشوں کا ایک اجمالی جائزہ پیش کر رہے ہیں۔ ان کے ذکر کے ساتھ ساتھ مجھے فخر ہے کہ میرے استاد جناب خواجہ ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی مرحوم نے اقبال کو ایرانیوں میں روشناس کروانے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ آپ کے بے شمار مقالات کے علاوہ اقبال ایرانیوں کی نظر میں، گفتہ ہائے رومی و اقبال، رومی عصر، اقبال، عرفانی اور اقبالِ ایران جیسی کتب اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ جن میں سے کچھ تو ایران میں بے حد مقبول ہوئیں۔ آپ فکر اقبال کے مبلغ کے طور پر ایران میں پہچانے گئے اور راقم الحروف نے اس کا مشاہدہ خود اپنے ایران کے سفروں کے دوران کیا۔

(جاری ہے)

سُودی معیشت سے چھٹکارا

وقت کی اہم ترین ضرورت

تحریر : حافظ عاکف سعید

سپریم کورٹ کے شریعت ایپلٹ بنچ میں سُود کے مسئلہ پر بحث گزشتہ تین ماہ سے جاری ہے۔ بینک انٹرسٹ کو ربا قرار دینے کا وفاقی شرعی عدالت کا تاریخ ساز فیصلہ حکومت کی مخالفانہ اپیل کے باعث گزشتہ دس برسوں سے تعطل کا شکار تھا۔ خدا خدا کر کے اس کی سماعت کی نوبت آئی تھی لیکن دو ماہ قبل جب یہ بحث اپنے پورے زوروں پر تھی اور عوام و خواص کی نظریں اس مسئلے کے حوالے سے سپریم کورٹ پر مرتکز تھیں تو اچانک ایک ماہ کے لئے اسکی سماعت معطل کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے لئے پاکستان کی ملی زندگی، ملکی معیشت اور مستقبل کے معاشی ڈھانچے کے اعتبار سے اہم ترین بحث ایک بار پھر پس پردہ چلی گئی۔ اوائل مئی ہی سے اگرچہ اس کی سماعت دوبارہ شروع ہو چکی ہے لیکن حکومت کا رویہ اس امر کی چغلی کھاتا ہے کہ وہ اس معاملے کو مزید طول دینے اور تاخیر و تعویق میں ڈالنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے ـــــ دوران سماعت فاضل جج حضرات کی جانب سے جو امید افزا کمنٹس آتے رہے ہیں ان کی بنیاد پر بجا طور پر یہ قیاس کیا جا رہا تھا کہ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھا جائے گا اور حکومتی اپیل مسترد کر دی جائے گی۔ اس قیاس کی بنیاد اس گہرے اعتماد پر قائم تھی جو پاکستان کے عوام کو یہاں کی اعلیٰ عدالتوں پر تھا لیکن گزشتہ چند ماہ کے دوران اعلیٰ عدالتوں کے بعض یکطرفہ فیصلوں نے اس اعتماد کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے اور یہ تاثر عام ہو چکا ہے کہ اب ہماری اعلیٰ عدالتیں بھی حکومتی دباؤ کو نظر انداز کر کے آزادانہ فیصلے کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھی ہیں ـــــ بہرکیف ہماری دعا ہے کہ یہ تاثر غلط ثابت ہو جائے اور سپریم کورٹ کا شریعت ایپلٹ بنچ سُود کے مسئلہ میں حکومتی دباؤ سے آزاد ہو کر عدل و انصاف کے تقاضوں کے مطابق حق بات کہنے اور درست فیصلہ کرنے کی ہمت و جرأت کر سکے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کی معیشت کو کھوکھلا کرنے اور ملک کو معاشی ہی نہیں اخلاقی دیوالیہ پن کی بھی آخری حدوں تک پہنچانے میں سُودی معیشت نے فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ سُودی معیشت پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے بدترین استحصالی نظام ہے جو "چہرہ روشن' اندروں چنگیز سے تاریک تر!" کا کامل مصداق ہے ـــــ معاشی عدل سے یکسر محروم اس نظام میں تمام ملکی و قومی وسائل اور دولت پر ایک مخصوص طبقہ قابض ہو جاتا ہے جسے قرآن نے "مترفین" کا نام دیا ہے' جبکہ ملک کی ایک عظیم اکثریت فقر و افلاس کا شکار ہو کر "محرومین" کی فہرست میں شامل ہو جاتی ہے ـــــ تقسیم دولت کا یہ انتہائی غیر منصفانہ نظام محض طبقاتی تفریق ہی کو جنم نہیں دیتا بلکہ بدترین سماجی بگاڑ اور شدید اخلاقی گراوٹ کا موجب بھی بنتا ہے ـــــ مترفین اور محرومین اگرچہ ایک ہی قوم کے افراد اور ایک ہی معاشرہ کا حصہ ہوتے ہیں لیکن ان کے درمیان نہ صرف یہ کہ اخوت و بھائی چارے کی فضا پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا بلکہ بیگانگی اور غیریت ہی نہیں شدید نفرت و عداوت کی خلیج حائل ہو جاتی ہے۔ ایسے استحصالی معاشرے میں محروم طبقات کو اگر موقع مل جائے تو وہ "طریق کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی" کے مصداق اپنے "آقاؤں" کا گلا کاٹنے اور ان کی عزت و ناموس کی دھجیاں بکھیرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ایک جانب مترفین کی ہوسِ دولت انہیں "آدمی دَرّندہ' بے دندان و چنگ" کے مصداق خونخوار بھیڑیا اور ناؤنوش کا عادی بنا کر انسانیت کے شرف سے محروم کر دیتی ہے تو دوسری طرف "کاد الفقر ان یکون کفرًا" کے مصداق فقر و افلاس کی انتہائی کیفیت "طبقہ محرومین" کو کفر کے دہانے تک لا پہنچاتی ہے۔ وہ محض ایک معاشی حیوان بن کر رہ جاتا ہے اور ایک غم روزگار کے سوا ہر دوسرا خیال اور بلند تر تصور یا نصب العین اس کے ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔ بقول شاعر ؎

دُنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اس کی حیثیت ایک کولہو کے بیل یا باربرداری کے جانور کی ہوتی ہے' چنانچہ نہ اللہ اور آخرت کا خیال اُسے کبھی آتا ہے' نہ دین اور مذہب اور ان کے تقاضوں کی جانب اس کا دھیان جاتا ہے اور نہ ہی اخلاقی و معاشرتی اقدار اور اصولوں کی اس کی نگاہ میں کوئی

وقعت ہوتی ہے۔ گویا فی الواقع یہ طبقہ بھی "شرفِ انسانیت" سے محروم ہو کر حیوانات کی صف میں جا کھڑا ہوتا ہے۔ ایسے معاشرے میں کرپشن فروغ پاتی اور خیانت پھلتی پھولتی ہے۔ فقر و افلاس سے مجبور ہو کر ایک گروہ لوٹ مار کرتا اور ڈاکے ڈالتا ہے اور دوسرا گروہ جو نسبتاً "کم ہمت اور بزدل" ہوتا ہے' خودکشی اور خودسوزی کی راہ اختیار کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ آج کا پاکستانی معاشرہ اس ہولناک صورتحال کی عملی تصویر نہیں تو اور کیا ہے!!

انسانوں کو شرفِ انسانیت سے محروم کر دینے والا یہ ابلیسی نظام سُودی معیشت کے بل پر استوار ہوا ہے۔ یہ نظام اللہ کے ساتھ کھلی بغاوت پر مبنی ہے' یہی سبب ہے کہ قرآن و حدیث میں سُود کی حرمت کے ذکر میں سخت ترین الفاظ استعمال ہوئے ہیں کہ "اگر سُود سے باز نہیں آتے تو سن لو کہ اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے!!"

اہل پاکستان اور بالخصوص حکمران طبقے کو جان لینا چاہئے کہ سُودی معیشت سے جان چھڑائے بغیر اور اس منحوس استحصالی نظام سے رستگاری حاصل کئے بغیر نہ تو پاکستان کے معاشی و اقتصادی حالات میں کوئی مستقل و پائیدار تبدیلی لائی جا سکتی ہے' نہ ملک سے بددیانتی اور کرپشن کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی بدامنی اور خوف و ہراس کی موجودہ فضا کو امن و امان میں بدلا جا سکتا ہے ـــــ کیا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف جنگ جاری رکھ کر ہم پاکستان کی حالت کو سدھارنا چاہتے ہیں؟

ایں خیال است و محال است و جنوں!

ڈاکٹر اسرار احمد کا نہایت اہم خطاب

جہاد بالقرآن

کتابی صورت میں دستیاب ہے

اشاعت خاص۔ /۳۰ روپے' عام۔ /۱۰ روپے

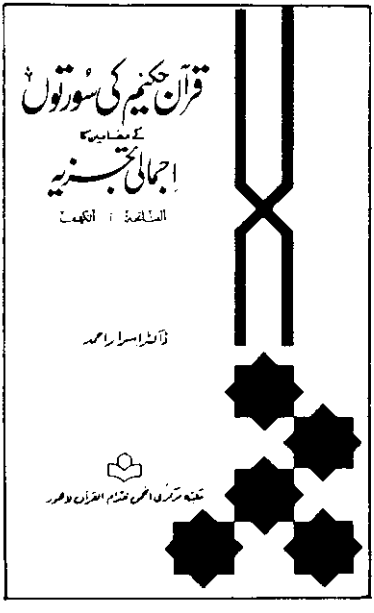

اشاعت خاص۔ /۶۰ روپے' عام۔ /۲۵ روپے

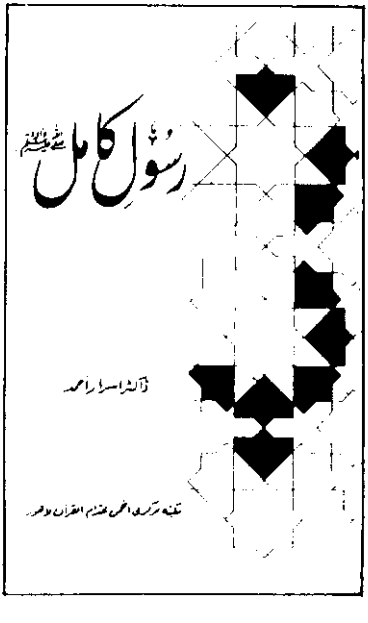

اشاعت خاص۔ /۱۶ روپے' عام۔ /۱۰ روپے

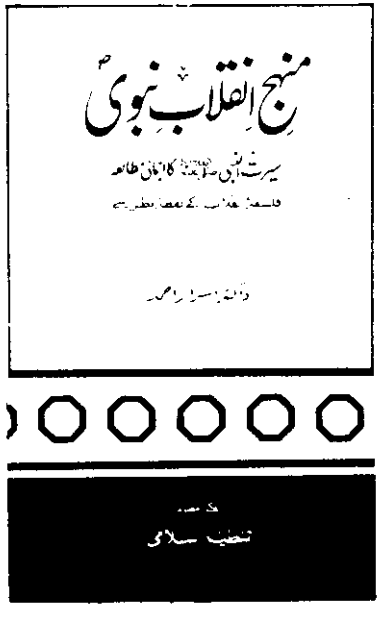

اشاعت خاص۔ /۱۶۰ روپے' عام۔ /۱۴۰ روپے

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Reg. No. CPL 125
Vol. 48 No. 6
June 1999